مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

المعروف

علی میاں

مقالات وخطباتِ سیمینار مع اہم خطوط ونادر تحریریں

ترتیب

محمد فاروق قریشی

جمعیۃ پبلیکیشنز

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون: 5433614

E-Mail: juipak@wol.net.pk

ضابطہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المعروف علی میاں
مرتب	:	محمد فاروق قریشی
ناشر	:	محمد ریاض درانی
سال اشاعت	:	مئی ۲۰۰۳ء
سرورق	:	جمیل حسین
کمپوزنگ	:	جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر وحدت روڈ، لاہور
مطبع	:	اشتیاق اے مشتاق پریس، لاہور
قیمت	:	-/۱۳۰ روپے

عرض ناشر	محمد ریاض درانی	۷
پیش لفظ	مفتی محمد جمیل خان	۹
دیباچہ	محمد فاروق قریشی	۱۳
علی میاںؒ	اکرام القادری	۳۹
مقالات		۴۱
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری	۴۳
کچھ یادیں کچھ باتیں	حسین حسنی	۴۹
بریشم وفولاد کا آدمی	ڈاکٹر یونس حسنی	۵۳
برصغیر کا قابل فخر اثاثہ	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۵۹
ایک عہد ساز شخصیت	پروفیسر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی	۶۵
سرمایہ ءملت کے پاسبان	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ	۸۹
مردِ مومن کا آخری سفر	نذر الحفیظ ندوی لکھنؤ	۹۹
خطبات		۱۰۵
مجموعہ ءمحاسن وکمالات	ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی	۱۰۷
علی میاں ـــ ایک عظیم شخصیت	حضرت مولانا فضل الرحمٰن	۱۱۳
قطعہ ءتاریخ وفات	سید نعیم حامد الحامد (مدینہ منورہ)	۱۱۸

مکتوبات ۱۱۹

مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی کے اہم خطوط اور نادر تحریریں

گزارش احوال — سید حسین حسنی ۱۲۱

خطوط:

سید احمد الحسنی ۱۲۵

سید حسین حسنی ۱۳۹

مکتوبات حسین حسنی بنام علی میاں ۱۶۱

بنام قاری سید رشید الحسن ندوی ۱۷۵

شیخ نذیر حسین لاہور ۱۸۹

مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۱۹۱

ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ۱۹۹

محترمہ امتہ اللہ تسنیم ۲۰۳

شاہد حسین ۲۰۴

محمد عامر قمر کراچی ۲۰۵

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری ۲۰۶

نادر تحریریں ۲۰۷

تبصرہ بر صمصام الاسلام ۲۰۹

دیباچہ نسب نامہ وشجرہ خاندان ۲۱۳

''تذکرہ حضرت سید شاہ عالم اللہ حسنی رائے بریلوی'' میں افسوس ناک تحریف اور اس کی نشان دہی ۲۱۴

انتساب

داعیٔ اتحادِ ملّی، مفکرِ اسلام

حضرت مولانا **مفتی محمود** رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

خوابیدہ اس شرر میں تھے آتشکدے ہزار

عرضِ ناشر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ علماءِ حق کے اس سلسلے کی سنہری کڑی تھے جنہوں نے ہر دور میں اعلاءِ کلمۃ الحق کی عزیمت پر عمل کیا۔ انہوں نے اپنے اسلاف کی تابندہ روایات کو اپنی جہد مسلسل اور اخلاص پیہم سے درخشندہ تر کر دیا۔

مولانا علی میاںؒ دینِ حق کے ایسے داعی تھے جس نے دنیا کے کونے کونے میں جا کر اللہ کی وحدانیت اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا علم بلند کیا۔

دعوتِ دین کے لیے انہوں نے کسی بھی مشکل کو لائق اعتنا نہیں سمجھا بلکہ بہر طور اور بہر صورت اس فریضہ کی ادائیگی میں تن من اور دھن سے مگن رہے۔

ان کی زندگی قابلِ تقلید اور موت قابلِ رشک ہے۔ انہوں نے بیشتر موضوعات پر انتہائی بیش قیمت تصانیف کا ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے جو گم کردہ راہ انسانیت کی ہدایت کے لیے صدیوں تک کافی وشافی رہے گا۔

ان کے انتقال کے بعد ان کی شخصیت اور خدمات پر مسلسل لٹریچر تیار ہو رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی دینی وملی خدمات پر اہلِ علم کا خراجِ عقیدت ہے۔

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان جو مفکرِ اسلام حضرت مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہ اور ان کے اکابر واسلاف علماءِ حق کی دعوت اور خدمات کی ترویج واشاعت کے لیے قائم کی گئی ہے اور راقم

بھی اس کی مجلس انتظامی کا رکن ہے نے حضرت علی میاں کی دینی وملی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کراچی میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس میں ملک کے نام ور اہل علم اور قومی رہنماؤں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا جس کو ہمارے محترم ومکرم جناب محمد فاروق قریشی صاحب نے انتہائی سلیقہ سے مرتب کر کے کتاب کی شکل دے دی۔

مقالات وخطبات کے علاوہ محترم حسین حسنی صاحب کے مرتب کردہ حضرت علی میاں کے مکتوبات کے شامل ہونے سے کتاب کی حیثیت دو چند ہوگئی ہے جو بلاشبہ اس موضوع پر ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ جناب محمد فاروق قریشی اور مفتی محمد جمیل خان صاحب جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان کے راہنما کی حیثیت سے میرے لیے ہمیشہ محترم رہے ہیں ان سے تعلق خاطر گزشتہ تین دہائیوں پر محیط ہے اور اب مفتی محمود اکیڈیمی کے قیام سے انہوں نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کا عزم کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے کارکنان جمعیۃ کے دلوں کی دھڑکن کو محسوس کر کے ہماری منزل کو قریب تر کر دیا ہے۔

میں اپنے محبین کا مشکور ہوں کہ اس خدمت کے لیے انہوں نے جمعیۃ پبلی کیشنز پر اعتماد کیا۔

اکیڈمی کی پہلی کتاب ''مفتی محمود ایک قومی راہنما'' شائع کرنے کا اعزاز بھی اسی ادارے کو حاصل ہے اور حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ سے متعلق دیگر لٹریچر بھی اکیڈمی کے تعاون سے شائع کیا جارہا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔

ہم نے کتاب کی اشاعت میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کیا ہے ہم اس میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں یہ آپ بتاسکیں گے مشک آنست بگوید نہ کہ عطار بگو

محمد ریاض درانی

مسجد پائلٹ ہائی سکول وحدت روڈ' لاہور

پیش لفظ

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ
وعلٰی آلہ وصحبہ اجمعین ..... اما بعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذرو قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون" (التوبہ)

''اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں ان کا ایک حصہ تا کہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جب کہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف تا کہ وہ بچتے رہیں۔''

رب کائنات نے امت میں مختلف طبقوں کی ضرورت کا اس آیت کریمہ میں اظہار فرمایا ہے تا کہ دنیا کے تمام شعبے ہر صورت میں اپنا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ ابتدائے اسلام میں چونکہ مجاہدین کی ہمہ وقت ضرورت تھی اس لیے اعلان جہاد ہوتے ہی ہر طبقہ اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر میدان جہاد کی طرف رواں دواں ہو جاتا یہی وجہ ہے کہ تبوک میں جب تین اصحاب نے بلا کسی عذر کے جہاد میں شرکت نہیں کی تو اجتماعی طور پر ان کی تنبیہ کے لیے معاشرتی بائیکاٹ کا راستہ اختیار کیا گیا لیکن جب حالات بہتر ہو گئے اور مجاہدین کی ایک معتد بہ تعداد جمع ہو گئی تو پھر آیت بالا کے مطابق تمام افراد کو جہاد پر کوچ کرنے کی بجائے ایک جماعت کو ہمیشہ علمی ذخیرہ کی حفاظت کے لیے مامور کرنے کا خدائی حکم نازل ہوا اور امت کے اہل علم جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی جانشینی کا شرف عطا ہوا' اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا کہ وہ ہر جہاد میں

شریک ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں اہل علم میں سے مفسرین، محدثین، حفاظ کرام کی کثیر تعداد میں شہادت کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ و حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اہل علم کے جہاد میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی اور ایک بڑی جماعت علماء کرام کی تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی، رب کائنات کا یہ حکم اور سنت نبوی کا یہ طریقہ ہر دور میں چلتا رہا اور امت کی ایک اچھی تعداد قرآن وحدیث کی حفاظت، دعوت وتبلیغ، تزکیہ نفس اور اصلاح مسلمین کا فریضہ انجام دیتی رہی اور مجاہدین کی بڑی تعداد جہاد میں مصروف رہی اور ہر طبقہ ایک دوسرے کی تائید ونصرت کا فریضہ انجام دیتا رہا، اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے تمام پہلوؤں پر امت کا عمل اور اسلام کے تمام احکامات اور شعبے محفوظ انداز میں خدمات انجام دیتے رہے اور کسی بھی دور میں اسلام کا کوئی حصہ معطل نہیں رہا، ہمارے ممدوح ومخدوم بزرگ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جن کو دنیا ''علی میاں'' کے نام سے جانتی ہے، اس طبقہ میں سے تھے جن کی بدولت علوم نبویہ کے خزانے محفوظ ہوئے اور پوری دنیا میں ایک ہستی کی بدولت اسلام کے تعلیمی نظام کی اشاعت ہوئی۔ شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی میاں کی وفات پر حضرت کو کس خوبصورت انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

> ''ہوش سنبھالنے کے بعد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ امام التبلیغ مولانا محمد یوسف کاندھلوی، محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری، سلطان القلم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے علاوہ پانچویں بزرگ جن کے کمالات، علوم ومعارف، فضل واحسان، ورع وتقویٰ، دعوت و عزیمت، حق گوئی، بے باکی، ملت اسلامی کے لیے گھلنے اور پگھلنے سے میں زیادہ متاثر ہوا، جن کی خدمات پر بے حد رشک آیا اور جن سے غائبانہ عقیدت محبت میں بدل گئی۔ آہ! حضرت اقدس مولانا سید ابو

الحسن علی ندوی قدس سرہ کی جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت تھی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المعروف بہ علی میاں قدس سرہ کے کس کس گوشہ حیات اور کمالات زندگی کو احاطہ تحریر میں لایا جائے۔ اسے کس طرح شروع کیا جائے اور کہاں سے شروع کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا' زبان وقلم اور الفاظ وحروف ساتھ نہیں دے رہے ہیں' حضرت مرحوم کی وفات کا سانحہ جہاں ہندو پاک کے مسلمانوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے وہاں عرب وعجم اور مشرق ومغرب کے مسلمان اس صدمہ سے دوچار ہیں۔ حضرت مولانا علی میاں کی وفات سے ایک طرف اگر پسماندگان اور متعلقین غم زدہ ہیں تو دوسری طرف ان کی وفات سے حجاز مقدس اور حرمین کے اکابر علماء اور ارباب اقتدار بھی اس صدمہ جانکاہ کو سہارنے کی ہمت نہیں پا رہے۔''

مولانا سید الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی خصوصیت علماء حق سے گہری وابستگی اور تصلب فی الدین کے ساتھ جدید معاشرہ کی اصلاح کے لیے ان کی دردمندی تھی۔ انہوں نے ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کو ماڈرن ادارہ سے بدل کر خانقاہ کا طرز دیا۔ انہوں نے علم کے ساتھ عمل کی روایت کو ندوہ میں زندہ کیا۔ وہ صوفی ہونے کے ساتھ جدید اہل علم کے نزدیک معتبر اور مستند شخصیت تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے علمی اثرات نے پوری دنیا میں ایک بڑے طبقہ اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی پوری زندگی اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی اصلاح کے درد کی کڑھن سے عبارت تھی' کم وقت میں ان کے علمی جواہر پارے اور قلمی شہ پارے اکابر علماء کرام کی دعاؤں کے ثمرات کے سوا کچھ نہیں تھے۔

''مفتی محمود اکیڈمی'' کی تاسیس کا مقصد اگرچہ حضرت مفتی محمود کی خدمات کو اجاگر کرنا اور مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے علمی خزانوں کو منظر عام پر لانا ہے اور اس

کے بانی محمد فاروق قریشی مفتی محمودؒ کے ساتھ عقیدت ومحبت میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں اور تہی دامنی کے باوجود اپنی اس محبت وعقیدت کے جذبہ کی وجہ سے حضرت مفتی محمود صاحب کی خدمات کے سلسلہ میں بڑے بڑے کاموں کا بیڑہ اٹھا لیتے ہیں' ان کی یہ محبت اگرچہ جذباتی حد تک مفتی محمودؒ کے ساتھ خاص ہے' مگر اہل علم اور مسلک حقہ دیوبند کے اکابرین کے ساتھ محبت و تعلق کا رشتہ ایک فطری تقاضہ ہے' اس لیے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رحلت نے ان کے قلب کو بے چین کر دیا اور اس وقت تک ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے جب تک انہوں نے ''مولانا علی میاں'' کے کارناموں کو روشناس کرانے کے لیے ''ایک سیمینار'' منعقد کر کے اپنے حق کی ادائیگی کی ایک سعی نہیں کر دی۔ سیمینار تو آغاز کا ایک بہانہ تھا دراصل مقصد حضرت علی میاں کی زندگی پر ایک کتاب کی ترتیب واشاعت تھا۔ سیمینار کے بعد باوجود بیماری کے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم' اپنے عزم وحوصلے اور حضرت علی میاںؒ کے تعلق کی برکت سے اس سیمینار کی تقاریر کو منضبط اور ان مقالات کی ترتیب کے ساتھ بعض اہم مضامین کو شامل کر کے ایک کاوش ''علی میاں'' کے نام سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی' جس کے لیے وہ اراکین مفتی محمود اکیڈمی خصوصاً ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری' حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی اور جمعیت علماء اسلام کے اکابرین اور قائد محترم حضرت مولانا فضل الرحمٰن دامت برکاتہم کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں اور ان کی خدمات قابل تحسین ہیں کہ ان کی وجہ سے مفتی محمود اکیڈمی کی زندگی کا ثبوت مہیا ہو جاتا ہے۔ یہ کاوش ''جمعیۃ پبلی کیشنز'' کی جانب سے شائع کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو امت کے لیے نافع بنائے اور اراکین مفتی محمود اکیڈمی کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین

محمد جمیل خان

خاک پائے شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

دیباچہ

زندگی کے بارے میں ایک مفکر کا قول ہے،

''ایسا کچھ لکھ کر جانا چاہیئے جو پڑھنے کے قابل ہو یا پھر ایسا کام کر کے جانا چاہیے جو لکھنے کے قابل ہو''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی حیات مبارکہ اس قول کی عملی تصویر تھی بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا کہ علی میاںؒ کی زندگی سے زیادہ یہ قول کسی اور پر صادق نہیں آتا۔

''سیرت سید احمد شہیدؒ سے لے کر'' کاروانِ زندگی'' تک علم وادب کی ایک سلسبیل ہے جو تشنگانِ علوم ومعرفت کی سیرابی کیلئے صدیوں تک کافی وشافی ہے۔

1936ء سے 1999ء تک تصنیف وتالیف کی 63 سالہ زندگی میں کم وبیش 176 تصانیف کے علاوہ بے شمار مقالات ومضامین یادگار ہیں۔

تصانیف بھی ایسی کہ محض عددی اعزاز کا باعث نہیں بلکہ اپنے قیمتی مواد، حسنِ تالیف اور دلکش اسلوبِ تحریر کی بنا پر ایسی مقبولِ خاص وعام کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں متعدد کتب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیئے گئے۔

تحریر کیا سہلِ ممتنع کا شاہکار ہے، ایسا سحر کہ ابھی تک جاری وساری ہے۔ آج بھی مارکیٹ میں ان کی تصانیف کا مکمل سیٹ دستیاب نہیں، کبھی ایک کتاب ختم ہوتی ہے تو کبھی دوسری ناپید۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے تصانیف کے علاوہ جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں ان کا احاطہ کسی ایک مضمون میں کرنا ممکن نہیں۔ ان کی دینی وملی خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ہر مرحلہ پر ایک نیا عنوان صاحبانِ علم وتحقیق کو دعوتِ فکر دیتا ہے، صورتِ حال بقول شاعر یوں ہو جاتی ہے۔

دامانِ باغباں سے کفِ گلفروش تک
بکھرے ہوئے ہیں سیکڑوں عنواں مرے لئے

مولانا پر ان کی زندگی میں بھی بہت کچھ لکھا گیا لیکن 31 دسمبر 1999ء کو ان کے وصال کے بعد سے تادمِ تحریر بہت سی کتابیں اور بے شمار رسائل کے وقیع نمبر اور خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

مولانا کے خاندانی پس منظر اور پیدائش تا وفات کے حالات وواقعات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی اہلیت وصلاحیت اور کارہائے جلیلہ پر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کہ محض ایک شخصیت اور اس قدر وسعت وتنوع!

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

لیکن یہ امرِ واقعہ اور حقیقت ہے کہ اس دورِ جدید میں بھی کسی ادارے، جماعت، انجمن اور اکیڈمی نے اپنے تمام تر وسائل اور اہمیت کے باوصف دینی، ملی اور علمی محاذ پر اس قدر ہمہ جہت اور وسیع تر خدمات انجام نہیں دیں جس قدر تنہا ایک سید ابوالحسن علی ندویؒ نے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت علی میاںؒ کے جدِ امجد حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی ایسے مردِ جلیل تھے جنہوں نے برصغیر میں جہاد علیٰ منہاج النبوۃ کی داغ بیل ڈالی۔

والد محترم وقت کے نامور عالم دین مولانا حکیم عبدالحیؒ لکھنویؒ تھے جو ''نزہتہ الخواطر'' اور ''گلِ رعنا'' ایسی عظیم اور ضخیم کتابوں کے مصنف اور ندوۃ العلماء لکھنو ایسے مہتمم بالشان ادارے کے ناظم تھے۔

نزہتہ الخواطر کیا ہے؟ پانچ ہزار نامور ہندوستانی مسلمانوں کے تذکرے پر مشتمل ایک خوبصورت انسائیکلو پیڈیا اور ''گلِ رعنا'' اردو کے معروف شعراء کا پہلا مربوط تذکرہ ہے گویا علم و ادب اور تحقیق و تصنیف کا ذوق آپ کو ورثہ میں ملا لیکن نو سال کی صغرسنی میں والد صاحب کے سانحہ ارتحال کے بعد تربیت کی ذمہ داری برادر بزرگ مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی اور والدہ محترمہ خیرالنساءؒ پر آ گئی۔

والدہ محترمہ حافظہ، قاریہ اور شاعرہ کے علاوہ علوم معرفت اور زہدہ تقویٰ کا پیکر تھیں۔ ان کے افکار عالیہ کی ایک جھلک ان کے اس خط میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے جب علی میاں نے لکھنو یونیورسٹی سے فاضلِ ادب کا امتحان پاس کر لیا اور انگریزی کی تعلیم شروع کی۔ انگریزی تعلیم کا دورانیہ 1927ء سے 1930ء تک تین سال پر محیط ہے۔ والدہ محترمہ نے انگریزی کی حد سے بڑھی ہوئی لگن کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ہونہار کو لکھا:۔

''علی تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو جنہوں نے علمِ دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی۔ ان کے مرتبے کیا تھے؟ شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ مولوی محمد ابراہیمؒ اور تمھارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب (حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ) اور مولوی محمد امینؒ صاحب (حضرت شاہ ضیاء النبیؒ صاحب کے خلیفہ) جن کی زندگی اور موت کس قدر قابلِ رشک ہوئی، کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی۔

یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟

انگریزی مرتبے والے تمھارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں

علی! اگر میری سوا اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی اب تم ہی ہو، اللہ پاک میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور مین دارین میں سرخ رو اور ایک نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں آمین ثم آمین یارب العالمین۔"

(کاروان زندگی جلد اول صفحہ 122 ماخوذ از ذکر خیر)

واقعی اللہ تعالیٰ نے اس عارفہ کی دعا قبول کی اور ایک سو رجال کار کی خصوصیات کا مجموعہ علی میاںؒ کی ذات واحد کو بنا دیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کا اپنی پیدائش کے ماحول، خاندانی پس منظر اور والدین کے علم وفضل میں کوئی دخل اور ذاتی کمال نہیں ہوتا، یہ حسن اتفاق یا وہبی خصائص کہلائیں گے لیکن علی میاںؒ اپنے وہبی محاسن کے علاوہ کسبی کمالات میں بھی ایک بلند و بالا شخصیت ہیں۔ مثلاً 1924ء میں بمعمر 10 سال عربی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کیا اور دو سال کے اندر اتنی قدرت حاصل کر لی کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس (1926ء) منعقدہ کانپور میں عرب ممالک کے وفود سے عربی میں بلا تکلف گفتگو کر کے علماء عرب کو حیران کر دیا۔

1927ء میں لکھنو یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو یونیورسٹی کے سب سے کم عمر طالب علم تھے اور فاضل ادب اعزازی پوزیشن میں پاس کیا۔

1927 سے 1930 تک انگریزی زبان سیکھی اور تین سال میں اس قابل ہو گئے کہ انگریزی لٹریچر کا براہ راست مطالعہ کرنے لگے۔ 1929 سے 1934 کے پانچ سال کے عرصہ میں انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنو مدرسہ قاسم العلوم لاہور اور دارلعلوم دیوبند ایسے مہتمم بالشان اداروں میں علامہ محدث حیدر حسن خانؒ، شیخ التفسیر مولانا احمد علیؒ لاہوری، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ایسے عدیم النظیر اساتذہ سے فقہ، ادب احادیث اور علوم القرآن کی تکمیل کی۔

1934 میں ندوۃ العلماء میں باقاعدہ تدریس کا آغاز کیا۔

علی میاں کتابی علم میں یکتا ہونے کے باوجود اس پر مکتفی نہ ہوئے انکے ذوق کی سیرابی اور طمانیتِ قلب ونظر کیلئے اسکے علاوہ بھی کچھ درکار تھا شاید وہ جان گئے تھے کہ:۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

شیخ بغدادیؒ نے بھی کہا ہے:۔

''تم کو اپنے ذہن وفہم پر جسقدر بھی اعتماد ہو مگر صرف کتابوں پر بھروسہ نہ کرنا۔ کتابیں علم نہیں دیتی ہیں علم عالم سے حاصل ہوتا ہے۔ علم ایک جاندار چیز ہے اس کو جاندار سے حاصل کرو، تمہاری سیرت پاکیزہ اور بزرگانِ سلف کا نمونہ ہونا چاہیئے تاکہ علم طبیعت کا جزو بن جائے''۔ (مقدمہ ابنِ خلدون صفہ 54)

قلب ونظر کی سیرابی کیلئے علوم ومعرفت کے مراکز سے رجوع کیا اور 1939ء میں حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہم اللہ ایسے صلحائے وقت سے تعلق قائم کیا۔ لاہور میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری کے تلمذ اور ارادت کے حلقے میں داخل ہونے کے ساتھ علامہ محمد اقبالؒ سے بھی ملاقات کی اور ان کی فکر سے خاصے متاثر ہوئے، اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے علامہ کے کلام اور شاعرانہ محاسن پر عربی میں ''روائع اقبال'' کے نام سے کتاب لکھ کر عرب دنیا کو اقبال کی عقابی فکر سے روشناس کرایا۔ اردو زبان میں یہ معرکتہ الاراء کتاب ''نقوشِ اقبال'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ نامور ادیب اور نقاد اس کتاب کو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ قرار دینے پر متفق ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ سے متعلق علی میاںؒ فرماتے ہیں:۔

"سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے جن کا ان کے معاصر میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہیں تینوں کا دخل پاتا ہوں میں ہر اس ادب اور

پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر انفس و آفاق کیلئے ابھارتا ہے جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں، اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔" (نقوش اقبال صفحہ 34-33)

علی میاںؒ جدید و قدیم کے امتزاج کا ذوق رکھتے تھے اور ندوۃ العلماء کا مقصد بھی یہی تھا کہ دیوبند اور علی گڑھ کے درمیانی فاصلے کو ختم کر کے دینی اور عصری علوم پر مبنی نصاب کی تعلیم گاہیں بنائی جائیں کیونکہ:۔

لالہ و گل کے جو سامان بہم ہوجاتے
فاصلے دشت و چمن زار میں کم ہوجاتے

لیکن چند اداروں کے قیام کے علاوہ اس فکر کو زیادہ پذیرائی نہ مل سکی تاہم علی میاںؒ کی دعوت دین کا خصوصی مخاطب جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ عوام الناس علماء سے وابستگی اور عقیدت کی بناء پر دین سے بیگانہ نہیں ہو سکتے لیکن عصری تعلیم گاہوں میں پروان چڑھنے والی نسل چند برخود غلط دانشوروں کے باوصف علماء سے بیزار اور دین سے برگشتہ ہوتی جارہی ہے۔ نسل نو کی سلامتی فکر اور دینی اقدار کے تحفظ کیلئے ان سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کرنا ہوگی اس لئے علی میاںؒ نے اپنے پیرائے اظہار کے لئے قدیم بوجھل اصطلاحات سے مرصع تحریر کی بجائے انتہائی سہل اور سادہ انداز کو اختیار کیا ان کی کسی بھی کتاب کو دیکھ لیں

بڑے سے بڑی بات کو بھی ایسے آسان پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ تکلف کا شائبہ تک نظر نہیں آتا اور بات بھی دماغ ودل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

شگوفے کھلنے کی موسیقیاں ہمیں تسلیم !

مگر وہ بات کہاں؟ جو تمہاری بات میں ہے

اردو ادب میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے بعد علی میاںؒ دوسرے بڑے انشاء پرداز ہیں جنہوں نے انتہائی سہل اور سلیس اسلوب اختیار کیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی جدید انشاء پردازی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں، اوق مسائل کو عام فہم زبان میں بیان کر دینے کی خوبی ان کے قلم کا خاصہ ہے۔

مولانا مودودی صاحب کی فکر سے متاثر ہونے کی راہ ان کے اسلوب تحریر ہی نے کھولی تھی لہذا علی میاںؒ بھی 1941 میں جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی حسنی اور مربی علامہ سید سلیمان ندوی ان کے اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھے بلکہ ڈاکٹر صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ۔

"مولانا مودودی کی تحریروں میں مجھے تجدد کی بو محسوس ہوتی ہے۔"

علی میاںؒ اصلاحی اور دعوتی ذہن کے حامل تھے مولانا مودودی صاحب کی صورت میں انہیں الحاد آلودہ فضا میں پروردہ نسل نو کیلئے ایک مسیحا نظر آیا لہٰذا انہوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ ان سے تعاون کیا اور جماعت اسلامی کے ذریعہ قوم میں دین کی دعوت کو عام کرنے کا فیصلہ کیا۔

مگر انہیں جلد اس کا احساس ہوگیا کہ وہ کسی نامناسب جگہ اور غلط ماحول میں آ گئے ہیں کیونکہ علماء سے لاتعلقی اور شخصیت پرستی کے جراثیم ارکان جماعت کے رگ وریشے میں پرورش پانے لگے اور امیر جماعت نے خود رائی' خودروی اور خود پسندی کی روش اپناتے ہوئے معاصرو اکابر علماء تو کجا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقدامات پر تنقید کو اپنا حق

سمجھتے ہوئے اپنے گرد ''انا اعلم'' کا ایسا حصار قائم کیا کہ خود کو تنقید سے بالا اور غلطی سے مبرا تصور کرنے لگے تو علی میاں ایسے جید عالم اور عارف باللہ کے لیے جماعت اسلامی سے علیحدگی کے سوا کوئی راستہ نہ رہا۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

"اس عرصہ میں میرے اندر تین احساسات پیدا ہوئے جنہوں نے مجھے جماعت سے وابستگی اور انتساب پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کیا۔

ایک یہ کہ میں دیکھتا تھا کہ مولانا (مودودی صاحب) کی شخصیت کے بارے میں جماعت کے افراد میں بڑا غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور مفکر مصنف اور داعی کے متعلق بلند خیال قائم کرنے، اس پر اعتماد کرنے اور اس کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا (اور بعض اوقات زبانوں پر بھی یہ بات آ جاتی تھی) کہ ان سے بہتر کسی نے اسلام کو سمجھا اور پیش نہیں کیا اور کلی دین کے داعی وہی ہیں۔

یہ افراد زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور ملازمین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا دین کا جو کچھ مطالعہ تھا وہ مولانا ہی کی تحریروں کے ذریعہ تھا۔ وہ نہ صرف علماء سلف بلکہ معاصر علماء کبار کی دینی خدمتوں اور دینی تحقیقات سے بھی ناواقف تھے اور اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید اور اس کے علمبرداروں کے علمی و عملی کارناموں سے بالکل نابلد تھے۔ اس لیے کسی حد تک معذور بھی تھے۔

دوسرے یہ کہ ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے اور علماء و دینی حلقوں کے بارے میں ان کی زبانیں بے باک ہو رہی ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ان میں دین کے ذوق و عمل میں کوئی ترقی، اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔"

(کاروان زندگی جلد اول صفحہ 244)

علی میاںؒ یوں تو ہمہ جہت صفات سے متصف اور بے پناہ محاسن وکمالات کا مجموعہ تھے وہ ادیب بھی تھے اور انشاء پرداز بھی مورخ بھی تھے اور نقاد بھی، معلم بھی تھے اور منتظم بھی مصنف بھی تھے اور محقق بھی، سالک راہ طریقت بھی تھے اور مجاہد بھی، متکلم بھی تھے اور مناظر بھی داعی بھی تھے اور راہ نما بھی، لیکن ان کی صفتِ غالبہ دین برحق کے داعی کی تھی وہ ہر حال اور ہر رنگ میں اسلام کے آفاقی پیغام کے داعی کے روپ میں نظر آتے ہیں۔

انہوں نے کسی خاص تنظیم یا جماعت کی جوئے کم آب میں سمٹنے کی بجائے ندوۃ العلماء اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے لیکر مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح تک بیشتر اداروں سے وابستہ ہوکر دین حنیف کی دعوت کے لئے بے کراں جدوجہد کو اختیار کیا۔

انہوں نے "خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات" پر اکتفا کرنے کی بجائے عزیمت و دعوت کی راہ اختیار کرتے ہوئے "وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل" پر عمل کیا۔

دنیا کے ہر افق کے باسی کو اپنا مخاطب جانا اور اس کی اپنی زبان میں خطاب کرکے بلغو عنی ولو آیہ کا فریضہ ادا کیا۔

وہ محض ندوۃ العلماء لکھنو یا صرف بھارت کی سطح تک محدود نہیں تھے بلکہ ان کی جدوجہد کا دائرہ اکناف عالم تک پھیلا ہوا تھا۔

وہ ندوۃ العلماء اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو کے صدر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے رکن، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سربراہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر مسلم مجلس مشاورت ہند کی شوریٰ کے رکن، رکن عربی اکیڈمی دمشق، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ اور مدینہ یونیورسٹی کے بانی رکن، رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت، رکن مجلس انتظامی اسلامی سینٹر جینوا، وزیٹنگ پروفیسر امارات ومدینہ یونیورسٹی، صدر آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی اور عربی واردو میں کتب کثیرہ کے بلند پایہ مصنف اور نامور محقق تھے۔

صاحبو! ذرا غور فرمائیں کہ کیا اس قدر وسعت کار اور مجموعہ محاسن کی متحمل کوئی جماعت یا ادارہ فی زمانہ ہوسکتا ہے؟ چہ جائے کہ محض ایک شخصیت۔

؎ ایں خیال است ومحال است وجنوں

علی میاں کا خاندانی پس منظر والدین کا اعلیٰ تربیتی ماحول تو خدا کی دین تھا ہی لیکن ان کا علمی اداروں کا انتخاب تعلیمی کیریئر میں انہماک واہلیت اور وقت کے عظیم علماء اور صلحائے امت سے تعلق خاص اور خدمت کا اعلیٰ شعار ان کی ذاتی محنت اور استقلال کا ثمرہ، علماء ربانی اور اولیاء اللہ کی دعاؤں کا مظہر اور خداوند بزرگ وبرتر کی عنایت خاص تھی۔

وہ عالم اسلام کی مشترکہ متاع تھے۔ بھارت میں مسلم کش فسادات ہوں یا انڈین گورنمنٹ کی مسلم دشمن پالیسی، کشمیر اور فلسطین میں خون مسلم کی ارزانی ہو یا عرب وعجم، یورپ امریکہ دنیا کے کسی بھی افق میں مسلمانوں کے اضطراب پر ان کا قلب مضطر بے قرار ہو جاتا تھا، وہ عالم اسلام کے ترجمان اور مسلمانوں کے تحفظ ومفادات کے نگران تھے اسی لئے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ان کے سانحہ ارتحال کو ہر مسلمان نے اپنا ذاتی نقصان تصور کیا اور ایسا نقصان جس کی تلافی کی مستقبل قریب وبعید میں کوئی امید نظر نہیں آتی:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان کے بنیادی مقاصد میں مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی دینی، سیاسی اور ملی خدمات کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ ان کے ہم عصر علماء حق، اساتذہ شیوخ اور اسلاف کے سوانح وخدمات اور افکار اور افادات کی تالیف وتدوین بھی شامل ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بیسویں صدی میں حق کے داعی اور جماعت علماحق کی ایک اہم شخصیت تھے۔ وہ مفکر اسلام مولانا مفتی محمود کے اسلاف کے پروردہ بعض اساتذہ سے فیض یافتہ اور ان ہی کی پیدا کردہ دعوت وعزیمت کے علمبردار تھے۔ وہ اپنے اسلاف کی جملہ

خصوصیات کے امین تھے۔

وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی وسعت نظری کے حامل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور شیخ التفسیر مولانا احمد علیؒ لاہوری کے شاگرد، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے معتقد خاص، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے پروردہ داعیٔ اسلام حضرت مولانا محمد الیاسؒ کاندھلوی حضرت شاہ عبدالقادرؒ رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ مہاجر مدنی ایسے صلحائے امت کے تربیت یافتہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا منظور احمد نعمانیؒ اور قاری محمد طیبؒ قاسمی ایسے نابغہ روزگار علماء کے ہم عصر اور وہ خود اپنے عہد میں امام غزالیؒ کی جامعیت، امام رازیؒ کی بلند نگاہی و نکتہ آفرینی اور حضرت جنیدؒ کے تقویٰ کی مثال تھے۔

ان کے افکار و افادات، دعوت و تبلیغ کے خصائص تصنیف و تالیف اور علمی و دینی خدمات کے تذکار و تعارف میں نہ صرف ایک ایک موضوع پر ایک ایک بلکہ کئی کئی کتابوں کی وسعتیں اور گنجائشیں بھی ناکافی ہوں گی اور جدا جدا موضوعات پر ڈاکٹریٹ کے متعدد مقالات لکھے جاسکتے ہیں۔

مفتی محمود اکیڈیمی پاکستان کراچی نے عالم اسلام کے بطل جلیل کے سانحہ ارتحال (۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء) کے حوالے سے اظہار غم اور ان کی شخصی عظمت اور علمی و دینی خدمات کے اعتراف اور خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔

سیمینار 20 فروری 2000ء بعد نماز ظہر تھیوسوفیکل ہال، ایم اے جناح روڈ، کراچی میں منعقد کیا گیا۔

زیر نظر کتاب اس سیمینار (مقالات و خطبات) کی روداد ہے لیکن اس روداد کے علاوہ محترم حسین حسنی صاحب کے مرتب کردہ خطوط کی شمولیت سے اس کی حیثیت دو چند ہوگئی ہے۔ اس پر اکیڈمی ان کی شکر گزار ہے۔

اجلاس کی نشست اول میں علی میاں کی سوانح وخدمات کے موضوع پر مختلف اہل علم نے مقالات پیش کئے جبکہ دوسری نشست میں جو بعد نماز مغرب شروع ہوئی راہنمایانِ ملت نے خطاب کے ذریعہ علی میاںؒ سے عقیدت کا اظہار کیا۔

مقالات پیش کرنے والوں میں اکیڈیمی کے چیئر مین ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے علاوہ خانوادۂ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نمائندہ، حضرت علی میاںؒ کے قریبی عزیز اور حضرت سید احمد شہیدؒ وحضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ پر کتب کے منصف جناب حسین حسنی صاحب حضرت سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان عالی مقام سے تعلق اور حضرت علی میاںؒ کے عزیز، شعبہ اردو جامعہ کراچی کے سابق صدر اور معروف قلم کار جناب ڈاکٹر یونس حسنی صاحب قائد اعظم اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور معروف اسکالر ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (مصنف کتب کثیرہ) شامل ہیں۔

محترمی ومکرمی ڈاکٹر محمد علی صدیقی کسی ناگزیر وجوہ کی بنا پر تشریف نہ لا سکے اور مقالہ بھیج دیا۔ ہم ان کی اس محبت کے بھی شکر گزار ہیں۔

محترم پروفیسر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی سابق ڈائریکٹر عربک چیئر کراچی یونیورسٹی، حضرت مولانا علی میاں کے نہ صرف شاگرد رشید ہیں بلکہ وہ علی میاں مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے اور مستفید ہونے سے بھی مشرف ہیں۔ ہم نے ان سے سیمینار میں شرکت کی درخواست کی تو انہوں نے پہلے سے طے شدہ مصروفیت کی بنا پر معذرت کرتے ہوئے اپنا مقالہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مقالہ حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں دریا بکوزہ کا حسین نمونہ ہے جو ماہنامہ ''تہذیب'' کراچی کے فروری ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔

ہم محترم ڈاکٹر رضوان ندوی صاحب اور ماہنامہ تہذیب کراچی کے شکریہ کے ساتھ اس پر محبت اور مفید تحریر کو شامل کتاب کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمتہ اللہ علیہ جنہیں اب مرحوم لکھتے کلیجہ منہ کو آتا

ہے، نے مساجد و مدارس کے علاوہ دیگر مقامات پر تقاریب میں شرکت نہ کرنے کا معمول اختیار کیا ہوا تھا اس لئے ان کا مقالہ ان کے رفیق خاص مجی ومکرمی مولانا سعید احمد جلال پوری صاحب نے بہت خوبصورت انداز میں نذر سامعین کیا۔

مفتی محمود اکیڈیمی کے نگران فقیہ ملت حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی مدظلہ (خلیفہ مجاز حضرت لدھیانویؒ) اور داعی اسلام حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب مدظلہ امیر جمیعت علماء اسلام پاکستان وسرپرست مفتی محمود اکیڈیمی پاکستان نے بڑی دل سوزی کے ساتھ حضرت علی میاںؒ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

دونوں حضرات کے خطبات کو تحریر کا جامہ پہنانے کیلئے قطع و بریدہ کی بجائے محض الفاظ کی تقدیم وتاخیر سے کام لیا ہے تاکہ مفہوم مجروح نہ ہو سکے پھر بھی کہیں کوئی جھول یا ابہام محسوس ہوتو وہ ہماری کوتاہی کی علامت ہوگا۔

ہمارے مخدوم ومحترم نابغہ روزگار حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت علی میاںؒ کی وفات پر اپنے جذبات کے اظہار کے طور پر مقالہ سپرد قلم کیا جو 20 فروری 2000ء کو اس سیمینار میں پڑھا گیا اور ازاں بعد ماہنامہ بنیات کراچی کے شمارہ میں بھی شائع ہوا لیکن ہماری کم نصیبی اور عالم اسلام خصوصاً اہل پاکستان کیلئے دوسرا المیہ کہ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ 19 مئی 2000ء کو شہید کر دئے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اکیڈیمی کی پہلی کتاب "مفتی محمود ایک قومی راہنما" میں حضرت کا ایک مضمون اور تقریظ شامل ہے اور علی میاںؒ سیمنار کیلئے بھی مقالہ تحریر فرمایا تھا لیکن عجیب اتفاق کہ دونوں کتابیں ان کی شہادت کے بعد شائع ہوئی ہیں۔

حضرت اقدس سے خاکسار کا عقیدت ومودت کا تعلق رہا ہے جو ربع صدی پر محیط ہے وہ ایک شفیق ناصح اور ہمدرد مربی ہی نہیں بلکہ ہر مرحلہ پر غم گساری اور چارہ سازی ان کی طبیعت کا

خاصہ تھا۔ان کی شہادت سے پورے ملک خصوصاً کراچی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہر شخص نے ان کی جدائی کے قلق کو محسوس کیا اور خود کو مستحق تعزیت سمجھا۔ان کا وجود اکیڈیمی کیلئے نعمت غیر مترقبہ تھا لیکن ان کے بعد صورت حال بقول فیض یوں ہے:۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

مفتی محمود اکیڈیمی کے ڈائریکٹر پبلیکیشنز اور میرے رفیق العزیز مولانا مفتی محمد جمیل خان صاحب ہمہ صفت موصوف اور تمام اکابر علماء حق کے مقرب خاص ہیں وہ انتہائی باکمال شخصیت ہیں ان کا پیش لفظ شامل کتاب ہے جس سے کتاب کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ "مردِ مومن کا آخری سفر" سمینار کا مقالہ نہیں بلکہ پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ کے جنوری 2000ء کے شمارے میں شائع علی میاںؒ مرحوم کے خدام خاص اور متعلقین کے تاثرات ہیں جس کی افادیت کے پیش نظر شامل کتاب کیا جارہا ہے اس طرح قطعہء تاریخ وفات بھی "تعمیر حیات" سے ماخوذ ہے۔

نظم "علی میاںؒ" جناب اکرام القادری صاحب (سابق مدیر ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور) نے خاص کتاب کیلئے عنایت کی ہے اس پر ہم ان کے مشکور ہیں۔

مکرمی پروفیسر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی صاحب کے مضمون اور محترمی مفتی نظام الدین شامزئی مدظلہ کے خطاب میں حضرت علی میاںؒ کے عرب قومیت کے مسئلہ کا ضمناً ذکر ہوا ہے اس باب میں وضاحت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عالمی استعمار نے اسرائیل کا خنجر عربوں کے سینے میں پیوست کرنے کیلئے دنیا جہان سے یہودیوں کو لاکر یہاں آباد کیا اور ان کو ہر لحاظ سے مسلح کرنا ان کی پالیسی کا بنیادی نکتہ قرار پایا۔

اس طاغوت کی سربراہی امریکہ اور ہمنوائی برطانیہ کے حصے میں آئی دونوں ممالک مسلمانوں کے ازلی دشمن ہیں عالم اسلام کے ان عالمی بدخواہوں نے عربوں کو ختم کرنے کیلئے

ہی اسرائیل کی نقب لگائی۔

امریکہ برطانیہ اور فرانس نے متحد ہو کر نہر سویز پر قبضہ کرنا چاہا تو گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں مصر کے مرد آہن جمال عبدالناصر نے ان تینوں ممالک کی افواج کو شکست دیکر نہر سویز کو قومیانے کا اعلان کر دیا تھا۔

امریکی سامراج کے مقابلہ میں جمال عبدالناصر نے روس سے تعاون حاصل کیا اور اپنے دور کی جدید ترین میزائیل ٹیکنالوجی سے ملکی دفاع کو مستحکم کیا۔ ناصر مرحوم مصر کے ترقی پسند اور سامراج دشمن راہنما تھے اس لئے امریکی سامراج کی آنکھوں کا کانٹا بن گئے تھے۔

مسلم ممالک میں امریکی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو اسلام دشمن مشہور کراتا ہے کیونکہ ہر اسلامی ملک میں مخصوص سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی بناء پر کچھ ادارے اور چند جماعتیں امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے ان کے راتب پر پلتی ہیں اس لئے اسے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں خاصی سہولت میسر آجاتی ہے۔

جمال عبدالناصر نے اسرائیل کے خلاف عربوں کو متحد کرنے کیلئے عرب اتحاد اور اس کیلئے عرب قومیت کا نعرہ بلند کیا ایسا کرنے سے ناصر کو فائدہ ہوا یا نہیں کم از کم امریکہ اور اس کے پروردہ حکمرانوں اور جماعتوں کو ناصر کو بدنام کرنے کیلئے ایک سلوگن مل گیا کہ خدانخواستہ وہ مسلم قومیت کے مقابلہ میں عرب قومیت کے مدعی ہیں۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد امریکی لابی نے یہ بات برسرعام کہنا شروع کر دی کہ مذکورہ شکست میں عرب قومیت کے نعرہ کی نحوست شامل تھی حالانکہ اس کے عوامل بالکل مختلف تھے ناصر مرحوم نے شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مصر کی صدارت سے استعفیٰ دیدیا تھا لیکن اہل مصر نے قبول نہیں کیا۔

عالمی سامراج کے سب سے بڑے دشمن جمال عبدالناصر نے شکست کی وجہ بھی بیان کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہم نے تمام قوت اسرائیل کی سرحدوں پر مرتکز کی تھی کہ وہی ہمارا ہدف

تھا۔ مسلم ممالک کی سرحدوں سے مطمئن تھے اس لئے اس طرف توجہ نہیں دی جبکہ مصر کے تمام میزائل ایک مسلم ملک کی سرحدوں سے پروازیں کر کے تباہ کر دئے گئے۔ یاد رہے اس وقت تک لیبیا میں کرنل معمر قذافی کا انقلاب نہیں آیا تھا وہاں امریکہ نواز شاہ ادریس کی حکومت تھی اس لئے وہاں کے ائرپورٹ استعمال کر کے مصر کی قوت کو تہس نہس کر دیا گیا۔ جیسے پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستان کی تمام دفاعی قوت بھارت کی سرحدوں پر ہوتی ہے۔ افغانستان کا بارڈر ایک برادر مسلم ملک کی سرحد خیال کر کے خالی رکھا جاتا ہے۔ اگر ایسے کسی موقع پر خدانخواستہ ایران و افغانستان کی سرحدیں ہی پاکستان مخالف ہو جائیں تو اس کے نتیجہ کے تصور کیلئے کسی غیر معمولی دانشمندی کی ضرورت نہیں۔

اسلامی تاریخ کی تلخ ترین حقیقت یہی ہے کہ مسلمانوں کی ہر ہزیمت میں مخالف سورماؤں کی ''جواں مردی'' سے زیادہ مسلم صفوں میں شامل میر جعفر اور میر صادق ایسے کرداروں کی "کرشمہ سازی" کارگر ثابت ہوئی ہے۔

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود دکھایا ہے مرے گھر کے چراغاں نے مجھے

عالمی سیاسی افق پر مسلم حکمرانوں اور راہنماؤں میں جو بھی امریکی سامراج کے حلیف نہ ہو سکے وہ مصر کے جمال عبدالناصر ہوں یا انڈونیشیا کے احمد سوئیکارنو، الجزائر کے احمد بن بیلا ہوں یا سوڈان کے ابراہیم عبود، لیبیاء کے معمر قذافی ہوں یا پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا غلام غوث و مولانا مفتی محمود ان تمام حضرات کو امریکہ اور اس کے حواریوں نے مختلف عنوانات سے اسلام دشمن قرار دے کر بدنام کرنے کی روش کو اپنایا ہے۔

جمال عبدالناصر تو ایک ماڈریٹ اور سیکولر حکمراں تھے لیکن مولانا غلام غوث ہزارویؒ ایسا مرد قلندر اور مولانا مفتی محمودؒ جیسا مفکر اسلام بھی ان کی ناوک افگنی سے نہ بچ سکے۔ ان کا جرم سوائے اس کے کیا تھا کہ وہ بہر طور امریکی سامراج کی حاکمیت کے منکر تھے اسی لئے سزاوار تکفیر

ٹھہرے۔

حیرت اس بات پر نہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ تعجب یہ کہ مولانا غلام غوث و مفتی محمودؒ بھی بایں علم و دانش مسلمان نہیں تو پھر مسلمان کیسے اور کہاں ہوتے ہیں؟

جمال عبدالناصر کے مقابلے میں اتحاد عالم اسلام کا نعرہ اسی بغض کا مظہر تھا۔ امریکی کیمپ میں شامل ممالک اس میں پیش پیش تھے وہ اپنے آقائے ولی نعمت کی خوشنودی کیلئے عالم اسلام کا اتحاد تو قائم نہیں کر سکے لیکن ناصر کی تحقیر و تذلیل میں ہمہ وقت کمر بستہ رہے۔

مصر کی اخوان المسلمون اور پاکستان میں جماعت اسلامی اس "جہاد" میں پیش پیش تھیں ان کے نزدیک جمال عبدالناصر گویا دائرہ اسلام سے خارج ہو چکا تھا اور اس پر تبرا عین اسلام ہے حالانکہ زیادہ سے زیادہ وہ ایک سیاسی نعرہ میں تعبیر کی غلطی کا گناہ گار تھا۔ شاید ایسی ہی کوئی صورتِ حال غالب کو بھی درپیش تھی جس پر وہ کہہ اٹھے کہ:۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

مولانا علی میاںؒ کا تعلق چونکہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ سے تھا اور سعودی عرب امریکی بساط کا مضبوط مہرہ تھا اور ان کے مصر کی اخوان المسلمون کے لوگوں سے بھی قریبی مراسم تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کے سامنے جملہ حقائق کی بجائے مغربی پریس کی خود تراشیدہ خبریں اور یکطرفہ غلط پروپیگنڈہ آیا اس بناء پر انہوں نے اپنے لٹریچر میں اخوان کی ہمنوائی اور ناصر کے خلاف سخت موقف اختیار کیا یہ ان کی ذاتی رائے تھی علماء امت کا مشترکہ موقف نہ تھا۔

پاکستان میں جمعیۃ علماء اسلام اپنے اسلاف کی روایات کے مطابق امریکی سامراج کی مخالف جماعت ہے جس نے ستر کی دہائی میں جماعت اسلامی اور دائیں بازو کی جماعتوں کے مسموم پروپیگنڈے کا بھرپور مقابلہ کیا یہاں تک کہ 1970ء میں ہونے والی آئین شریعت کانفرنس لاہور میں مصر اور لیبیا کے سفیروں کو مدعو کرے ان سے مکمل یک جہتی کا مظاہرہ کیا اور

ان کو زبردست اخلاقی حمایت فراہم کی جس کی پاداش میں جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں خصوصاً مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا مفتی محمود کو سوشلسٹ مولوی کے نام سے ملک میں بدنام کرنے کی مہم چلائی گئی۔

مفتی محمود اکیڈیمی مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود کے انقلابی نظریات کی حامی اور موئید ہے اس ضمن میں ہم مولانا علی میاںؒ کے موقف سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اپنے تمام علم وفضل اور محاسن وکمالات کے ساتھ لائق احترام شخصیت ہیں لیکن عملی سیاست کبھی ان کا میدان نہیں رہا اس اظہار کے باوجود ہمارے دل میں ان کے احترام میں ذرّہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی۔ ان سے اس پہلو میں اختلاف کے باوجود ان کی عظمت اور ہماری عقیدت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

سیمینار میں شریک تمام مقالہ نگار حضرات اور علماء کرام کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے علمی مشاغل سے وقت نکال کر ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔

خصوصی طور پر قائد محترم برادرم مولانا فضل الرحمان صاحب کا مشکور ہوں کہ وہ سیمینار کے روز بنگلہ دیش کے دورے سے وطن لوٹے اور کراچی سے اسی روز اسلام آباد جانے کا پروگرام تھا لیکن ان سے ائرپورٹ پر پروگرام میں شرکت کی درخواست کی تو انہوں نے بخوشی قبول کرتے ہوئے اپنے پروگرام کو ملتوی کر دیا ہم ان کی اس عنایت اور محبت کے شکر گزار ہیں۔ انہوں نے مولانا علی میاںؒ سے اپنی نہایت عقیدت کا اظہار کیا اور انہیں زبردست الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اتفاق یہ ہے کہ 20 فروری کی شب وہ شامل پروگرام ہوئے 21 کو روانگی طے تھی کہ اچانک جمعیت علماء اسلام کراچی کی ہر دل عزیز شخصیت، مجلس احرار کے بنیادی کارکن، مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم کے رفیق کار اور حضرت مولانا مفتی محمود کے میزبان حکیم جمال الدین مرحوم کے بڑے صاحبزادے جو مولانا فضل الرحمان کے مستقل میزبان

رہے یعنی بھائی سعید الدین کا اچانک انتقال ہوگیا اور نماز جنازہ مولانا فضل الرحمان نے پڑھائی۔

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں حکمت پوشیدہ ہے اگر مولانا حسب پروگرام کراچی سے چلے جاتے تو دوسرے روز تعزیتی سلسلے میں واپس آنا پڑتا۔

حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب نے اپنی تقریر میں 1980ء میں منعقدہ دارالعلوم دیوبند کے صدسالہ جشن میں مولانا علی میاںؒ مرحوم اور حضرت مولانا مفتی محمود کی تقاریر اور مفتی صاحب کی اس تجویز کا حوالہ دیا ہے کہ آئندہ ایسے پروگرام پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی ہونے چاہیں۔

1980ء میں دارالعلوم دیوبند کا عظیم الشان صدسالہ جشن دیوبند (انڈیا) میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں پاکستان سے تقریباً ڈیڑھ سو افراد حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی قیادت میں شریکِ اجلاس ہوئے تھے۔ وفد میں جید علماء کرام اور فضلاء دارالعلوم شامل تھے۔ مولانا فضل الرحمان صاحب بھی شریک وفد تھے۔

. اجلاس میں مولانا سید ابوالحسن علیؒ ندوی نے بڑی معرکۃ الآراء تقریر کی تھی اس کے بعد حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کا خطاب تھا جنہوں نے علی میاں کی تقریر کی تائید کرتے ہوئے یہ تجویز دی تھی کہ آئندہ ایسے پروگرام نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی ہونا چاہئیں۔ دونوں بزرگوں کی تاریخی تقریریں جمعیۃ پبلی کیشنز کی شائع کردہ کتاب ''دارالعلوم دیوبند احیاء اسلام کی عالم گیر تحریک'' میں شامل ہیں۔ حسن اتفاق کہ جمعیت علماء اسلام پاکستان نے ڈیڑھ صدسالہ خدمات دارالعلوم دیوبند کانفرنس کا اعلان کیا اور اسکی میزبانی کے لئے جمعیت علماء اسلام صوبہ سرحد نے پیش کش کی۔

یہ تاریخی کانفرنس 11-10-9 اپریل 2001ء کو پشاور (تاراجبہ) میں منعقد کی گئی۔ یہ پاکستان میں منعقد ہونے والا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے

اکناف سے تقریباً بیس لاکھ فرزندانِ دارالعلوم کے علاوہ مسلم ممالک اور ہندستان کے وفود کے ساتھ امریکہ، برطانیہ، یورپ اور افریقی ممالک کے نمائندگان نے بھی شرکت کی۔

بھارت کے وفد میں امیر جمعیت العلماء ہند جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ، دارالعلوم دیوبند کے وفد اور مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمان کے علاوہ، مظاہر العلوم سہارن پور مدرسہ شاہی مرادآباد کے وفود اور بیشتر علماء ودانشوروں نے شرکت کی۔

مقالات وخطبات کے علاوہ کتاب کا دوسرا حصہ حضرت علی میاںؒ کے خطوط اور چند نادر تحریروں پر مشتمل ہے جو محترم سید حسین حسنی صاحب کی کاوش کا ثمرہ ہے۔

مکتوبات یا خطوط نویسی ابتدائے آفرینش ہی سے کاتب اور مکتوب دونوں کیلئے اہم رہی ہے۔ دونوں فریق معلوم اور سطحی ادراک بھی واضح ہوتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے دانش ور ڈاکٹر یوفان کے نزدیک ''اسلوب خود انسان ہے''۔

مگر اشخاص وحالات کے اختلاف سے یہ مختلف ہوتا ہے۔

اصنافِ ادب میں مکتوبات ایک مستقل اور اہم صنف ہے اور اس آئینہ میں گردوپیش کے تمام رنگ افق پر قوس وقزح سے زیادہ نکھر کر منعکس ہوتے ہیں۔

اس باب میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس کے آداب وفن اور تاریخ پر خاصہ لٹریچر موجود ہے۔ ''رقعاتِ جامی'' مکتوباتی ادب کا اہم سرمایہ ہے۔ اردو ادب بھی اس موضوع پر مالا مال ہے۔

معروف محقق مالک رام نے صحیح کہا ہے کہ دنیا کا قدیم ترین مطبوعہ خط سورہ نمل قرآن مجید میں موجود ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے اہل سبا کو لکھا گیا ہے۔ یہ مختصر ترین یک سطری خط دنیا کا جامع ترین خط بھی ہے جو یوں ہے۔

الاتعلو علی و آتونی مسلمین

''تم لوگ میرے مقابلہ میں تکبر نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے حضور چلے

آؤ۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین کیلئے خطوط لکھے اور آج بھی ان میں سے چار خطوط اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باقاعدہ دارالانشاء قائم کیا۔

عربی، یونانی، فارسی، انگریزی اور اردو ادب میں خطوط نویسی ایک اہم صنف کے طور پر قبولِ عام ہے۔

مکتوبات کے ذریعہ دین کی دعوت سے لیکر دل کی بات کہنے تک کے فرائض بحسن خوبی ادا کئے گئے ہیں۔

اگر شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ نے مکتوبات کے ذریعہ دعوت الی اللہ اور تصوف کا فریضہ انجام دیا ہے تو مرزا اسداللہ خان غالب، سرسید احمد خان، علامہ محمد اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ نیاز فتح پوری، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے مکتوبات کو علم وادب کا مخزن بنا دیا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ اپنے محبوب سے اظہار محبت کے لئے خطوط نویسی کبوتر سے بہتر تیر بہدف نسخہ ثابت ہوا ہے۔

دیکھئے بیدلؔ حیدری نے کیسے لطیف پیرائے میں کیا کہہ دیا ہے:

تو اچھوتا ہے تجھے خط بھی اچھوتا لکھوں
سادہ کاغذ پہ بس اک لفظِ تمنا لکھوں

صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام اس صنفِ ادب کی بہترین مثال ہے جو ایک عرصہ ہوا "زیرِ لب" کے نام سے شائع ہو کر اہلِ ادب سے داد پاچکے ہیں۔

خطوط نویسی میں مرصع ادب کا دور مرحوم ہو چکا ہے۔ سہل نویسی کے بانی سرسید احمد خاں مرحوم تھے۔ مکتوبات میں اردو ادب نے مولانا ابوالکلام آزاد ایسا قلمکار پیدا نہیں کیا وہ اپنی مثال

آپ تھے۔ علامہ نیاز فتح پوری مرصع اور سہل نگاری دونوں میں رواں تھے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سہل نویسی کو اختیار کر کے عام لوگوں کے دلوں پر دستک دی ان کی تقریر ہی نہیں تحریر بھی ایسی سادہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عام زبان میں بلا تکلف گفتگو کر رہا ہے۔

مولانا کی وفات کے بعد 74 خطوط پر مشتمل ایک مجموعہ 2001ء میں شائع ہوا ہے جو مجلس نشریات اسلام کراچی کے مولانا فضلِ ربّی ندوی صاحب کے نام ہیں اور عموماً اشاعتی سلسلے سے متعلق ہیں۔ ان کی اپنی اہمیت ہے۔

زیرِ نظر خطوط مختلف لوگوں اور مختلف عنوانات وواقعات سے متعلق ہیں جو عام قارئین اور خصوصاً علی میاںؒ کے محبین ومتوسلین کی دلچسپی کیلئے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

قومی راہنماؤں کی زندگی قوم کی امانت ہوتی ہے ان کی خلوت اور جلوت ان کے چاہنے والوں کا محبوب موضوع ہوتا ہے۔

حضرت علی میاںؒ کے خطوط تو بلا شبہ انتہائی اہم ہیں لیکن جناب حسین حسنی صاحب کے خطوط بھی کم اہم نہیں ہیں۔ انشاء وادب میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ خطوط میں ان کی تحریر کی جولانی اور قلم کی روانی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب نے مکتوب الیہ کا انتخاب غلط نہیں کیا۔ کہیں کہیں تو ابوالکلام آزاد اور نواب بہادر یار جنگ کی مراسلت کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔

پچاس خطوط کے مجموعہ میں حضرت علی میاںؒ کے 45 خطوط ہیں جبکہ پانچ خطوط جناب حسین حسنی صاحب کی طرف نے لکھے گئے ہیں۔

17 خطوط سید حسین حسنی اور 9 خطوط ان کے بھائی احمد الحسنی مرحوم جو حضرت علی میاںؒ کے قریبی عزیز ہیں کے نام اور 12 خطوط جامع مسجد نیو ٹاؤن (علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی) کے خطیب قاری سید رشید الحسن صاحب ندوی کے نام ہیں جو شومئی قسمت سے ۲۸ جنوری ۲۰۰۱ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے ہیں خدا ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

وہ بہترین قاری، جید عالم اور انتہائی متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ قاری صاحب اور جامع مسجد نیوٹاؤن گویا دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہو گئے تھے کسی ایک کو دیکھتے تو دوسرے کا تصور از خود آجاتا۔ انکو دیکھتے اور سنتے تو ایک عرصہ ہوا مگر 1992ء میں حج کے سفر میں ان کی ہمراہی کا شرف حاصل ہوا تو ان کی حسن اخلاق سے معمور شخصیت کے پرت کھلتے چلے گئے۔ لیکن ان کی جدائی بھی قسمت کا لکھا تھا جو پورا ہو کر رہا۔ سچ ہے کہ:۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تجھ کو میر سے صحبت نہیں رہی

ایک خط سلطان القلم علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم کے نام ہے جو ترکی سے لکھا گیا تھا لیکن خط ملنے سے پہلے علامہ گیلانیؒ راہیٔ ملک عدم ہو گئے۔

ایک خط اسلامک انسائیکلو پیڈیا کے مرتب شیخ نذیر احمد مرحوم کے نام ہے۔ برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی حسنی، ہمشیرہ محترمہ امتہ اللہ تسنیم اور شاہد حسین صاحب کے نام بھی ایک ایک خط شامل مکتوبات ہے۔

جناب عامر قمر صاحب اور محترم ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی عمر میں اللہ تعالیٰ برکت دے اور ان کو صحت وعافیت کے ساتھ زندہ رکھے۔ ایک ایک خط ان دونوں حضرات کے نام بھی ہے۔

اس مجموعہ میں ایک تاریخی اور بہت کام کی چیز صمصام الاسلام پر مرحوم علی میاںؒ کا تبصرہ ہے۔ صمصام الاسلام شاہ نامہ اسلام کی طرز پر فتوح الشام کا منظوم شاہ کار ہے جسے علامہ عبدالرزاق کلامی نے تضمین کیا ہے۔ حضرت علی میاںؒ صمصام الاسلام کی اشاعت کے متمنی تھے جو کسی ناشر نے بوجوہ پوری نہیں کی تاہم ان کا تبصرہ جناب حسنی صاحب نے شامل کتاب کیا ہے تاکہ کم از کم یہ تاریخی ادبی چیز محفوظ ہو جائے اس کے لیئے ہم ان کے مشکور ہیں۔

قارئین کرام سے آخر میں ایک اور بات بھی عرض کرنی ہے!

اکیڈیمی کے قیام کے موقع پر تعارفی کتابچہ میں اغراض و مقاصد اور پروگرام پیش کیا تھا۔ ہمیں بڑا اعتماد تھا اور مصمم ارادہ بھی، دوستوں کو بھی بہت توقعات تھیں لیکن افسوس کہ اکیڈمی کے قیام کے بعد سے ہی ایسا مرض لاحق ہوا کہ لکھنا پڑھنا کارِ دشوار ہو گیا۔

صحت کا توازن بگڑ جانے کی وجہ سے لکھنے سے کسی حد تک معذوری رہی، پڑھنے کی عیاشی تو کسی نہ کسی حد تک جاری رہی لیکن لکھنے کی مشقت بس میں نہ رہی۔

اس صورت حال سے احباب ہی شکوہ کناں نہیں بلکہ میں خود بھی پشیمان ہوں ورنہ چار پروگرام اور دو کتابوں کا شائع کرنا کوئی کام نہیں۔ دل تو بہت کچھ چاہتا ہے لیکن صحت آڑے آ گئی سوچا تھا کہ:۔

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے
میرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

بہر حال عذر کچھ بھی ہو اپنی کوتاہیٔ عمل کا معترف اور احباب و قارئین سے معافی کا خواست گار ہوں۔

امید ہے کہ آئندہ اہل شوق اور اصحاب ذوق کو نہ انتظار ساغر کھینچنا پڑے گا اور نہ خاکسار کو منت کشِ عفو و درگزر ہونا پڑے گا۔

کئی کام پیشِ نظر ہیں اور انشاء اللہ جلد ہی قارئین محترم کی نظروں سے گزریں گے۔ اس سلسلہ کی پہلی چیز بنوں (صوبہ سرحد) میں مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود سیمینار کے یادگار مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ مقالات کمپوزنگ کے مرحلہ میں ہیں خدا کرے صحت اس قابل رہے تو انشاء اللہ کوئی چیز اشاعت میں تاخیر کا موجب نہ ہوگی۔

زیر نظر مجموعہ مقالات و تقاریر سیمینار مولانا سید ابوالحسن علیؒ ندوی اور اس کے ساتھ یادگار خطوط اور نادر تحریریں پیش کی جا رہی ہیں وہ ضخامت و قامت کے اعتبار سے خواہ کہتر نظر آئیں لیکن اسکے مشمولات کی تاریخی اور ادبی اہمیت نے اسے بہ قیمتِ بہتر کی مثال بنا دیا ہے۔

امید ہے کہ قارئین کرام پسند فرمائیں گے۔

آخر میں ایک خوش گوار فریضہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے تمام احباب کا مشکور ہوں جن کے پر خلوص تعاون اور کاوشوں کی بدولت یہ کتاب قارئین تک پہنچانے کے قابل ہو سکا۔ محترم ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری ایسے فاضل محقق کی سرپرستی اور تعاون میرے لئے باعث فخر ہے جبکہ اکرام القادری، مفتی محمد جمیل خان، محمد ادریس اپل اور الطاف حسین موتی کی رفاقت و مشاورت سرمایہء جاں ہے۔ جمعیۃ پبلی کیشنز کے عزیزم حافظ محمد ریاض درانی صاحب کے تعاون اور محبت کا ہمیشہ سے مقروض ہوں۔

اکیڈمی کے مخلص اور فاضل رفیق برادرم افتخار صاحب، ڈاکٹر محمد شکیل، اکبر شاہ ہاشمی، محمد اسلم حمایتی اور محمد اسلم کٹیا نے سیمینار کے انتظام و انصرام اور مولانا مشتاق الرحمان زاہد و ڈاکٹر امیر زادہ نے کتاب کی تیاری میں میرے لئے ہر سہولت بہم پہنچانے کے لئے خود کو وقف کئے رکھا۔

یہ ناکارہ دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مخلصین کو جزائے خیر سے نوازے۔

محمد فاروق قریشی

۲۱ دسمبر ۲۰۰۲ء کراچی

علی میاں

سب اہلِ علم ان پہ فدا ان کے جاں نثار
کیوں علم کی سند نہ ہو نامِ علی میاںؒ

ہر دور میں ہوئے ہیں عظیم و جلیل لوگ
لیکن کچھ اور ہی ہے مقامِ علی میاںؒ

ساقی بھی مے کدہ بھی ہے لیکن نہیں کوئی
لذت شناسِ بادۂ جامِ علی میاںؒ

عرب و عجم ہے ان کے لکھے پر فریفتہ
ہے لفظ لفظ نقش و دوامِ علی میاںؒ

ان کے لہو میں رائے بریلی کا امتزاج
کلک علی میاں ہے حسامِ علی میاںؒ

شہدائے بالاکوٹ انہیں حرزِ جاں رہے
اور آج بھی یہی ہے پیامِ علی میاںؒ

جس کو عزیز تنگ نگاہی و زیغ و ضیق
اس کو خبر نہیں ہے مقامِ علی میاںؒ
تھے اہل حق کہیں بھی کسی بھی مقام پر
پہنچا وہاں وہاں پہ سلامِ علی میاںؒ
تحریر آسماں پہ ستارے جڑے ہوئے
یاقوت و زبر جد ہے کلامِ علی میاںؒ
خدمت گزار دیں بنا چاہتے ہو گر
اٹھے ہر ایک گام بہ گامِ علی میاںؒ
اکرام علم و حکمت و دانائی سے روشن
صبح علی میاں ہو کہ شامِ علی میاںؒ

(اکرام القادری)

سوانح
۷۱۱۳
۱۴۱۰۷۲

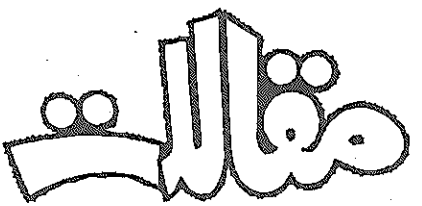

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(شخصیت وسیرت پر ایک سرسری نظر)

دنیا میں بڑائی اور عظمت کے کئی معیار دنیا والوں نے بنا لیے ہیں۔ ان میں مال و دولت کی کثرت، سروسامان عیش و راحت کی فراوانی، کوٹھی، بنگلہ، ملازم، جاگیر، طاقت و قوت، عہدہ و منصب، حکومت و اقتدار لوازم شان و شوکت سمجھے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ان چیزوں کی بھی اہمیت ہے، اس سے انکار نہیں۔ مال و دولت، جاہ و منصب اور حکومت و اقتدار کا صحیح استعمال کیا جائے اور انہیں مخلوق خدا کی خدمت کا وسیلہ بنالیا جائے تو انسان عظمت اور بڑائی سے ہم کنار ہوسکتا ہے اور دنیا والوں کی آنکھوں کا تارا بھی بن سکتا ہے۔

لیکن انسان کی اصل بڑائی اور عظمت اس کے عقیدۂ صحیح اور عمل صالح میں ہے۔ انسان کو صحیح عقیدے کی طرف اللہ کی رہنمائی اور عمل صالح کی توفیق الٰہی نصیب ہو جائے، اس سے زیادہ انسان کے لیے کوئی بڑائی نہیں۔ اسی میں اس کی سعادت بھی ہے۔ علم کو عقیدے سے الگ نہ کریں اور عقیدے کو آپ ایمان کہہ لیں تو ایمان اور عمل دو بنیادی اور اہم چیزیں ہیں جن پر انسانی عظمت کا ہیکل تعمیر ہوتا ہے۔ علم اور عقیدے کی جدائی کو میں نے اس لیے گوارا نہیں کیا کہ میرے عقیدے میں علم اور جہالت ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔ علم اور جہالت میں دشمنی اور لاگ کا تعلق ہے۔ علم ایمان کو چمکاتا ہے اور عمل کو آب و تاب بخشتا ہے۔ ایمانِ صحیح اور عمل صالح کے اجتماع سے ایک تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ اس تہذیب ہی کا نام اسلام ہے۔ ایمان ایک شجر معنی اور عمل صالح اس کا ثمر ہے۔ ایمان باطن اور عمل صالح اس کا اظہار و نمود

ہے۔ اگر یہ اظہار نہ ہو تو کہا جائے گا کہ ایمان حلق سے نیچے نہیں اترا اور اگر ایمان و عمل میں تضاد ہو تو اس پر کامل یا ناقص معنی میں فسق کا اطلاق ہوگا۔ جب تک ایمان حلق سے نہ اترے اور عمل صالح کی صورت میں اس کا اظہار نہ ہو وہ تہذیب پیدا نہیں ہو سکتی جس کا نام اسلام ہے اور اقوام عالم میں مسلمان کا طرۂ امتیاز اور اس کی پہچان ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ جن کی یاد میں یہ جلسہ ہے۔ ایمان صحیح اور عمل صالح کی ایک دل آویز تصویر تھے۔ وہ اسلام کا مجسمہ تھے۔ وہ اس تہذیب کی مثال تھے جسے میں نے ابھی اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کامل معنوں میں اور ایک سچے مسلمان تھے۔ عقیدہ و ایمان کے رسوخ، قلب کے صفا اور عمل کی پاکیزگی نے انہیں علما و صلحا اور جماعت اتقیا کا محبوب اور امت کا مطاع اور موجودہ عہد میں مسلمانوں کا مرجع بنا دیا تھا۔ عام علمائے کرام تو ان کے علم و فکر کی وسعت و بلندی، ان کی شرافت و نجابت، اخلاق و تہذیب اور ان کی دینی و علمی خدمات کی بدولت ان کے معتقد اور گرویدہ تھے ہی۔ ان کے عقیدت مند اور ارادت کیش ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش سے لے کر اسلامی ممالک اور افریقہ و یورپ کے دور دراز علاقوں میں بڑے شہروں اور چھوٹی بستیوں تک عوام و خواص میں پھیلے ہوئے تھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیاں جمع فرما دی تھیں۔ وہ حسنی سادات کے ایک عظیم الشان خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور اس خاندان کی تمام علمی، دینی، اخلاقی، تہذیبی روایات ان کے حصے میں آئی تھیں اور انہوں نے نہ صرف خاندانی وراثت علم و تہذیب کو برقرار رکھا تھا بلکہ اس میں خوب سے خوب تر اضافہ کیا تھا۔ ان کے حصے میں جو بہترین خاندانی روایات آئی تھیں ان پر انہیں فخر کرنا چاہیے تھا لیکن ان کا وجود گرامی اپنے اسلاف خاندان کے لیے بھی موجب فخر تھا۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے ذہن و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، مختلف علوم و فنون میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ منقولات و معقولات پر انہیں

یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ ملت اسلامیہ کے بلند پایہ مصلح و مربی اور اسلام کے ترجمان تھے۔ ان کا شمار اس عہد کے مفکرین اسلام میں ہوتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن ندویؒ عربی اور اردو کے بلند پایہ مصنف اور صاحب طرز انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعے اردو کے مختلف علوم اور ادب میں تو بیش قیمت اضافہ کیا ہے، عربی ادب کو بھی انہوں نے مختلف علوم و موضوعات میں بہترین تصنیفات سے نوازا اور تحریر و نگارش کے بہترین اسلوب اور انشا پردازی کے شاہکار دیے ہیں۔ مولانا رحمہ اللہ عربی کے ایک عجمی ادیب و انشا پرداز اور مصنف و خطیب کی حیثیت سے پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے قابل فخر اور اہل عرب کے لیے وہ ایک قابل رشک شخصیت کے مالک تھے۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیفات، مضامین، خطبات میں امت کے مختلف طبقات کو مخاطب کیا ہے اور درپیش مشکلات و مسائل اور آنے والے خطرات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ملت کی بیداری کے لیے انہوں نے زبان اور قلم کا ہر طریقہ اختیار کیا، انہوں نے عوام کو جگایا، خواص کو پکارا، علمائے دین کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، اصحاب درس و تدریس کو مسلمانوں کی بیداری میں ان کی اہمیت جتائی، اہل علم کو غور و فکر کی دعوت دی اور اہل تدبر و سیاست کو تنبیہ کی۔

حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ صرف محراب و منبر کی شخصیت نہ تھے۔ انہوں نے صرف وعظ و قرطاس و قلم ہی سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو رومانی سیاست اور تحریکات کا زمانہ گزر چکا تھا انہوں نے صرف خواب نہیں دیکھے، جہاں عمل کا تقاضا ہوا وہاں قرطاس اور قلم سے ہاتھ اٹھالیا، مسند درس و تدریس اور مجالسِ وعظ و تبلیغ کو برخاست کر دیا اور میدانِ عمل میں نکل آئے۔ مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور اجرا و نفاذ کی تحریک کے وہ رکن رکین تھے۔ قیامِ امن کے لیے کوشاں رہے۔ فرقہ وارانہ اتحاد کے قیام کے لیے دورے کیے،

ملک کی غیر فرقہ وارانہ جماعتوں اور انصاف پسند غیر مسلموں سے قریب تر ہوئے، ملت کے عشق میں بہترین آرزوؤں کے چراغ جلائے تھے۔ اسلامی زندگی کے قیام کی تمنا میں جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے مگر ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!''

جمعیت علمائے ہند اس کے بزرگوں اور ملت کے غم گساروں سے ہمیشہ تعلق رکھا، تبلیغی جماعت کے دعوت وارشاد کے کاموں میں حصہ لیا، اتحاد بین المسلمین کے قیام کی مساعی میں مصروف رہے۔ اسلامی قوتوں کے اجماع کے لیے کوششیں کیں، مدارسِ اسلامیہ میں ربط پیدا کیا، مختلف ذوق وفکر اور صلاحیتوں کے لوگوں کو منظم کیا، ان کے لیے ادارے قائم کیے۔ تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت افکار اور علوم ومعارف کی تحقیق وتدوین کے ادارے اور اکیڈمیاں قائم کیں۔

مولانا کی تصنیفات، مذہب، عقائد وعبادات، دعوت وارشاد، ادعیہ ووظائف، کتاب وسنت، تہذیب وتمدن، تذکار وسوانح، سیاحت وتعلیم، تاریخ وتحریکات، سیاسیات وغیرہ علوم وفنون میں یادگار ہیں اور صرف تعداد کے لحاظ ہی سے قابل توجہ نہیں بلکہ موضوعات کی ندرت، مطالب کی جامعیت، معیار کی بلندی، تالیف وتدوین کے حسن، زبان کی تازگی اور شگفتہ بیانی اور اسلوب کی طرفگی کے لحاظ سے بھی پسندیدہ خاطر، انمول معلومات اور بیش بہا افکار کا خزانہ اور ہر صاحب ذوق کے منتخب ذخیرۂ علمی کی زینت بننے کے لائق ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جنہیں حرف عام میں علی میاں کے پرمحبت لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت کا خمیر ملت کی بہی خواہی اور دردمندی اور غم گساری کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی فلاح وبہبود مولانا کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اتحاد بین المسلمین ان کا مقصد حیات تھا۔ وہ اسلام کے اعلیٰ ترجمان اور تمسک بالکتاب والسنّت کے داعی تھے۔ وہ انسان دوست تھے اور اپنوں اور بیگانوں سے محبت کرتے تھے۔ دین کی عصبیت اور حمیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، زندگی کے عام معاملات اور معاشرتی تعلقات میں

بہت روادار تھے۔ وہ زہد وورع کی تصویر اور دین داری کی علامت تھے لیکن تقشف ان میں نام کو نہ تھا۔ وہ فراخ قلب تھے اور تنگ نظری اور تعصب سے دور ونفور! ان کی انسانی خوبیوں نے غیر مسلموں میں بھی ان سے محبت کرنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کر دیا تھا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عرف علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا وجود سامی ایک علمی وتہذیبی روایت کا حسین تسلسل تھا۔ انہوں نے الصدر الشہید حضرت سید احمد رائے بریلوی اور سکندرِ وقت وعازمِ دعوتِ عزیمت شاہ اسماعیل شہید کی دعوتِ اصلاح وجہاد کو موجودہ دور میں ایک نیا موڑ دیا ہے۔ انیسویں صدی کے ربع اول میں جب ہر دو شہدائے اسلام وملت نے میدانِ جہاد اور شہادت گاہِ بالاکوٹ کی طرف اقدام وسعی کا سفر شروع کیا تھا تو وقت کا وہی تقاضا تھا لیکن جب علی میاں مرحوم نے آزادی کے بعد انیسویں صدی کے نصف ثانی میں حیاتِ سید احمد شہید کی تالیف کے لیے سوانح نگار کا قلم اٹھایا تھا، تاریخ دعوتِ عزیمت کی تدوین کے لیے معلومات وافکار کی جستجو شروع کی تھی اور مورخ کا منصب سنبھالا تھا تو وقت اسی کا مقتضی تھا۔ تحریک اصلاح وجہاد کے سلسلے میں حیات سید احمد شہید کی تالیف اور تاریخ دعوتِ عزیمت کے سلسلے میں تصنیفات کا حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے، آج اس کی اہمیت کے اندازہ شناس بہت کم ہوں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اہل علم اور اصحابِ نظر کو اس کی معنویت اور فکری اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ اس وقت حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ان کے مراتب کو بلند فرمائے اور مسلمانوں کو ان کے افکار وافادات سے استفادے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کچھ یادیں، کچھ باتیں

(مولانا علی میاں کے تعلق سے)

معزز سامعین!

ابھی پچھلی عید سے ایک دن قبل تکیہ سے احمد علی کا ٹیلیفون آیا۔ میں نے پوچھا کہاں رکھا.....؟ کہنے لگے روضہ میں..... یہ روضہ مسجد کے سامنے ایک احاطہ ہے، چہار دیواری خاصی بلند ہے۔ صرف دو دروازے ہیں۔ جنوب کی طرف سئی (Sai) ندی احاطہ سے ٹکرا کر بہتی ہے اور مغرب میں مسجد ہے۔ اس احاطہ میں ہمارے جدِ بانی دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں۔ حضرت سید شاہ علم اللہ صاحب محو استراحت ہیں۔ احاطہ خاصا بڑا ہے اور چھت نہیں ہے۔ قبریں کچی ہیں۔ نشان زدہ بھی نہیں ہیں۔ اوپر گھاس ہی گھاس ہے صرف تین قبریں یاد ہیں۔ یہ مخصوص جگہ تھی جب تک میں ہندوستان میں رہا میں نے اس احاطہ میں کسی کو دفن ہوتے نہیں دیکھا اور نہ سنا۔ اعزا کو مسجد کے پیچھے قبرستان میں دفن کیا جاتا تھا۔

۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر صاحب..... مولانا مرحوم کے برادر بزرگ حکیم و ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کو بھی اسی احاطے میں دفن کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں گیا تو وہیں فاتحہ پڑھی۔

احمد علی ..... ڈاکٹر صاحب کی نواسی کے شوہر، میری بیوی کے چھوٹے بھائی..... ''دائرہ عرفات'' میدان پور، تکیہ کلاں کے مہتمم۔

یہ اکتوبر ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ میں ایبٹ آباد (ہزارہ) میں تھا۔ محمد ثانی کا کوہاٹ سے خط آیا۔ ''میں اور ماموں جی آ رہے ہیں۔ بالاکوٹ کا پروگرام ہے۔'' محمد ثانی مولانا کے بھانجے، وہ مولانا کو ماموں جی کہتے تھے، یہ تبلیغی اجتماع میں کوہاٹ آئے تھے۔

میں بہت خوش ہوا۔ مگر کچھ پریشانی بھی لاحق ہوئی کیونکہ اس وقت تک میری بیوی

ہندوستان سے نہ آئیں تھیں' میں ایک ہوٹل میں رہتا تھا۔ یا اللہ.....! اب کیا کروں؟ خاطر مدارات اور مہمان نوازی کس طرح ہوگی؟

صرف محمد ثانی آئے اور ان کے ساتھ مولوی احسان اللہ میں نے پوچھا..... ارے! ماموں جی کیوں نہیں آئے؟ کہنے لگے انہیں ارشد صاحب لاہور لے گئے۔ ارشد صاحب مرحوم ڈی' جی (D.G) ٹیلیفون۔ بعد میں ارشد صاحب سعودی عرب میں ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔

محمد ثانی کو ایبٹ آباد کی سیر کرائی۔ دوسرے دن بالاکوٹ گئے۔ خوب خوب فوٹو بازی کی۔ محمد ثانی بتاتے جاتے تھے اور میں فوٹو لیتا جاتا تھا۔ جگہ جگہ کے فوٹو لیے۔

ایبٹ آباد واپسی ہوئی تو اخباروں سے معلوم ہوا کہ دریاؤں کے سیلاب نے ریلوے لائن اور سڑک کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا ہے' لاہور پہنچنا بہت مشکل بلکہ محال ہے۔

محمد ثانی کے لیے ڈی جی (D.G) ٹیلیفون کا ہرکارہ آیا۔ ''مولانا کہتے ہیں۔ آپ کندیاں' مظفر گڑھ ہوکر ملتان اور وہاں سے لاہور آ جائیں۔ جلد از جلد ہندوستان واپس ہونا ہے۔''

محمد ثانی بادلِ ناخواستہ روانہ ہوئے۔ مگر بڑے رنجیدہ کبیدہ خاطر اور ملول۔ لکھنو پہنچ کر خط لکھا۔ راستہ کی روداد' سفر کے شدائد اور کچھ مجھ سے ناراضگی کا اظہار۔ ''تم نے مجھے کیوں نہ روکا''.....؟ ان حالات میں اور جب کہ پیغام اوپر سے آیا ہو اور ہندوستان واپسی کی جلدی ہو' میں کیسے روک سکتا تھا۔

مولانا محمد ثانی ایڈیٹر رضوان' لکھنو۔ مصنف سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی۔ میرے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوست۔ یہ دوستی ایک مسٹر اور ایک مولانا کی دوستی تھی۔

''میں اپریل ۱۹۴۸ء میں سال آخر انٹر کا امتحان دے کر اٹاوہ سے محمد ثانی سے ملنے لکھنو چل دیا۔ محمد ثانی نے بتایا کہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری تکیہ آ رہے ہیں۔ ہم دونوں تکیہ گئے۔ حضرت رائے پوری سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ مولانا مرحوم حضرت رائے پوریؒ سے

بیعت تو تھی ہی، سب گھر والے بھی بیعت ہوئے۔ گھر کے آنگن کے درمیان رسی باندھ کر پردے ڈلوا دیے گئے۔ پردے میں سے ایک دوپٹہ باہر کیا گیا اور خواتین نے اسے پکڑے رکھا۔ حضرت نے اسے تھام کر دعا پڑھی۔ اس طرح بیعت ہوئی۔ مرد حضرات حضرت کے پاس پردے کے باہر رہے۔ میرے لیے یہ دلچسپ منظر تھا۔''

عزیز محمد میاں..... مولاناؒ کے بھتیجے..... محمد الحسنی ایڈیٹر ''البعث الاسلامی'' ہم لوگ محمد میاں کو چھیڑتے..... ''چھوٹے ڈاکٹر صاحب'' وہ خوب ہنستے۔ وہ باپ کے مثنیٰ تھے۔

۶ جولائی ۱۹۷۸ء میں رابطہ عالمِ اسلامی کی پہلی کانفرنس منعقدہ کراچی وہ بھی ایک ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے چچا کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے انہیں اپنی گود میں کھلایا تھا۔ انہیں علاحدہ سے اپنے گھر لے آیا۔ کھانا کھا کر وہ میری کتابیں دیکھنے لگے۔ ابن انشاء کی کتاب ''اس شہر کے اک کوچہ میں'' دیکھی تو کہنے لگے ابن انشاء مجھے پسند ہیں' میں نے جاتے وقت وہ کتاب انہیں خرید کر دی۔

مولانا مرحوم کی پھوپھی میری چچی تھی۔ وہ میرے چچا حافظ سید محمد طلحہ صاحب مرحوم سابق پروفیسر عربک اورینٹل کالج لاہور کی اہلیہ تھیں۔

دوسری طرف مولانا مرحوم کی اہلیہ محترمہ میری قریبی بہن تھیں۔ یہ رشتہ کچھ یوں تھا مولانا کی خوش دامن میرے والد کی حقیقی ماموں زاد بہن اور والدہ کی حقیقی چچازاد بہن تھیں۔

میں نے انہیں اپنے ماموں حافظ سید محمد اسحاق ریٹائرڈ سیکرٹری حکومت پاکستان کے انتقال کی اطلاع دی اور لکھا کہ ان کے انتقال سے میرے حقیقی بزرگوں میں سے اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ ''یہی بات ہماری بیوی نے بھی ہم سے کہی۔''

میں انہیں خط میں ''محترم و مکرم علی بھیا'' لکھا کرتا تھا اور وہ مجھے ''عزیز القدر حسین سلمہ'' لکھتے اور آخر میں ''دعا گو ابوالحسن علی''

میں نے سب سے پہلے ان کی کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' پڑھی جو گھر میں تھی.....

بہت مختصر..... شاید دو سوا دو سو صفحے بھی نہیں ہوں گے۔ یہ کتاب اب دو جلدوں میں ہو گئی ہے بلکہ مولانا کی سب سے بہتر کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا آخری حصہ بن گئی ہے۔

میں نے جب تاریخ اسلام میں گریجویشن کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مسلمانوں کی تاریخ کے دو حصے ہیں۔ پہلا تاریخ اسلام' دوسرا ''مسلمانوں کی تاریخ'' میں تاریخ دعوت و ہزیمت کو تاریخ اسلام کہتا ہوں اسی طرح شیخ محمد اکرام کی کتابوں آبِ کوثر' موجِ کوثر' رودِ کوثر کو بھی تاریخ اسلام میں شامل کرتا ہوں۔

خلفائے راشدین کے بعد کی تقریباً ساری تاریخ کو مسلمانوں کی تاریخ میں شامل کرتا ہوں۔

کہیں پڑھا تھا کہ عرب اقبال کو تاغور المسلمین کہتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ٹیگور..... حال آں کہ ٹیگور اور اقبال میں کوئی مناسبت نہیں۔ سوائے اس کے کہ دونوں شاعر تھے۔

مولانا کی کتاب ''نقوش اقبال'' نے اس بات کو بالکل صاف اور واضح کر دیا ہے اور عرب اقبال کو خوب سمجھنے لگے ہیں۔ اقبال..... اقبال ہیں۔ تاغور المسلمین نہیں ہیں۔ شورش کاشمیری نے بھی لکھا کہ اقبال پر اب تک دو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک ''نقوش اقبال'' مولانا ابو الحسن علی ندوی کی۔ دوسری ''روحِ اقبال'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی۔

اب اس کا دور بیت چکا ہے۔ اس شاہِ گدا نما سے اس کے دیس کی راہیں اداس ہیں پر اس کا گیت اس کے دیس کی بستیوں اور ان کی گلیوں میں گونج رہا ہے۔ اس کی صدائے بازگشت دیس سے باہر دور تک سنائی دے رہی ہے اور اس کی نے کے سب لذت شناس ہیں۔

اب ''کاروانِ زندگی'' رک گیا ہے۔ اب ''پرانے چراغ'' کون لکھے گا.....؟ وہ خود پرانے چراغوں میں شامل ہو گئے۔ کل من علیھا فان. ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

حسین حسنی

۲۵/۱/۲۰۰۰

بریشم وفولاد کا آدمی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے قرابت داری بھی تھی۔ میں ان کی دینی، علمی اور ادبی کتابوں کے ذریعہ ان کی علمیت سے بھی واقف تھا۔ مگر ان سے ذاتی شناسائی نہ تھی۔ وہ لکھنو اور رائے بریلی میں قیام فرماتے تھے اور میں بھوپال میں رہتا تھا۔ یہ سن ۵۷/۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ بھوپال کی تاج المساجد میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا کرتا تھا۔ مولانا عمران میاں اس اجتماع کے میزبان اور یوں اس کے تمام امور کے کرتا دھرتا تھے۔ مولانا علی میاں لکھنو کی جماعت کے ساتھ اس اجتماع میں تشریف لائے۔

ان دنوں ہم نوجوانوں نے اسلامک یوتھ آرگنائزیشن کے نام سے ایک جماعت بنا رکھی تھی۔ اس کے ارکان کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔ یہ مسلم نوجوانوں میں دینی بیداری کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ مگر یہ مختصر سی بے بضاعت جماعت بھی حکمرانوں کی نظر میں خطرناک سمجھی جاتی تھی۔ بہرحال ہم نے طے کیا کہ سیفیہ کالج کے ہال میں بھوپال کے کالجوں کے مسلم طلبہ کو جمع کیا جائے اور مولانا علی میاں ان سے خطاب کریں۔ مولانا کی منظوری حاصل کرنے کے لیے تین چار افراد تاج المساجد میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا سے قرابت کے پیش نظر مجھے اس وفد میں شامل کر لیا گیا۔ تاج المساجد پہنچ کر مولانا کا کیمپ تلاش کیا۔ وہ معتبرین کی ایک جماعت کے ساتھ ملے۔ وہاں مولانا عمران میاں بھی موجود تھے۔ مولانا تبلیغی جماعت سے باہر اسلام کے زیادہ قائل نہ تھے۔ ہم نے علی میاں کی خدمت میں اپنی درخواست گزاری تو فرمانے لگے۔ یہاں کے امیر تو مولانا عمران میاں ہیں ان سے اجازت لینا ضروری

ہے۔عمران میاں فرمانے لگے ''اس وقت تو یہ تبلیغی جماعت کے اجتماع میں مصروف ہیں اجتماع ختم ہو لے تو آپ ان سے بات کر لیجیے گا'' مگر جس شام اجتماع ختم ہوتا اس کی علی الصبح مولانا کی روانگی طے تھی۔

ہم نے عرض کیا مسلم نوجوانوں سے مولانا کا خطاب ضروری بھی ہے اور ان شاء اللہ مفید بھی ہوگا اس لیے اس کام کے لیے وقت نکالنے میں کوئی ہرج نہیں۔مولانا علی میاں نے بڑی بے بسی سے عمران میاں کی طرف دیکھا'' مگر عمران میاں بضد تھے کہ مولانا پر اس وقت صرف ان کا حق ہے۔میں نے ہمت کر کے علی میاں کو مخاطب کیا'' ہمارا بھی آپ پر حق ہے۔اسلام کے رشتے سے بھی اور قرابت کے سبب بھی'' مولانا موم کی طرح پگھل گئے۔عمران میاں نے ان کو یوں پگھلتے دیکھا تو وہ بھی نرم پڑ گئے اور مولانا کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر کسی زیادہ اہم کام کے لیے نکل گئے۔ہمیں وقت دے دیا گیا۔مولانا سیفیہ کالج تشریف لائے تو اس کا مرکزی ہال نوجوانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔مولانا نے بڑی دلسوز اور پر جوش تقریر کی۔اس اجتماع کی بازگشت عرصے تک بھوپال میں سنائی دیتی رہی۔اسلامک یوتھ آرگنائزیشن کی دعوت کو بھی اس سے بڑا فائدہ ہوا اور اس کے حلقہء تعارف میں وسعت پیدا ہوئی۔مولانا کی وسیع النظری نے مسلم نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔

۱۹۶۱/۶۲ء میں جبل پور اور ساگر میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ہندو مسلم فسادات تو وہ کیا تھے مسلم کشی کا ظالمانہ مظاہرہ تھا۔ان فسادات کا ردعمل پوری دنیا میں ہوا۔اس کے چند ماہ بعد ہی جدہ میں اسلامی کانفرنس کا اجلاس ہوا۔اس اجلاس کے ایک سیشن میں ایک ایسی قرارداد منظور ہوئی جس میں مسلم کش فسادات کے لیے بھارت کی مذمت کی گئی تھی۔اس کانفرنس میں ہندوستانی مسمانوں کے قائد مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے۔ہندوستانی پریس نے واویلا مچا دیا کہ اس کانفرنس میں یہ قرارداد کیوں منظور ہوئی اور ہندوستانی مندوب نے اس کی مخالفت کیوں نہ کی۔اس مندوب کو ہندوستان آتے ہی گرفتار کر لیا جانا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

مولانا جدہ سے واپس ہندوستان آئے تو صحافیوں نے ان کو گھیر لیا اور یہی سوالات کیے۔ مولانا نے انتہائی نرمی سے جواب دیا ''اس کانفرنس میں جب مسلم اقلیتی ممالک کے امور زیر بحث آئے تو متعلقہ ممالک کے مندوبین کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے جس اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی میں اس میں بلایا ہی نہیں گیا تھا مگر مولانا نے اپنی بات صورت واقعہ کے اظہار پر ختم نہ کی اور فرمایا ''لیکن اگر میں مدعو ہوتا تو ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت سے اس صورتِ حال پر شرمندہ ہونے کے علاوہ کیا کر سکتا تھا'' اس جرات مندانہ جواب کے بعد ہندوستانی صحافت کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی اور اس کی گھن گرج جاتی رہی۔

شاید یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ میں دلی کے ایک روزنامہ سے وابستہ تھا اور ''خبر و نظر'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا کرتا تھا۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب چوں کہ مسلم وقف بورڈ کے چیئرمین تھے۔ اس لیے مسلم اوقاف کے معاملات میں کوتاہی کی صورت میں مفتی صاحب کا ذکر اکثر میرے کالم میں آ جایا کرتا تھا۔ ان دنوں مفتی صاحب بھارتی مسلمانوں کے ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے روس تشریف لے گئے۔ عین انہی دنوں میں مولانا علی میاں اپنی آنکھوں کے علاج کے لیے فرانس گئے ہوئے تھے۔ دونوں محترمین نے اپنے اپنے سفر کے حالات و تاثرات لکھ بھیجے۔ مفتی صاحب نے کچھ یوں لکھا تھا کہ کون کہتا ہے کہ روس میں اسلام مٹ گیا۔ یہاں مسجدیں کھلی ہیں' اذانیں اور نمازیں ہو رہی ہیں۔ خود میں تاشقند کے امام مسجد کے گھر مدعو کیا گیا اور ان کی بیگم نے مجھے اپنے ہاتھ سے چائے پیش کی۔

مولانا علی میاں نے فرانس سے لکھا کہ یورپ اپنی تمام تر بے راہ رویوں سے تنگ آ گیا ہے اور اب اسے کسی مرد مومن کی تلاش ہے جو اسے راہِ حق دکھائے وغیرہ۔ میں نے یہ کیا کہ دونوں کے بیانات انہیں کے الفاظ میں خبر و نظر میں جمع کر دیے اور اس پر سرخی درج کر دی

''کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور''

اس کالم کے شائع ہونے کے چند روز بعد ہی مولانا علی میاں نظام الدین میں تبلیغی

اجتماع میں تشریف لائے۔ ہمارے ایک ساتھی سب ایڈیٹر عزیز الٰہی صاحب تھے۔ بڑے آدمیوں سے ملنے کے بڑے شوقین اور مولانا کے انتہائی عقیدت مند مجھ سے کہنے لگے ''حسنی صاحب کیوں نا علی میاں سے ملنے چلیں۔ آپ کی ان سے قرابت ہے' اس لیے قدرے بے تکلفی سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔'' میں راضی ہو گیا اور مغرب بعد ہم نظام الدین کے لیے روانہ ہو گئے۔ نظام الدین پہنچے تو عشاء کا وقت تھا مجھے غسل خانے بھی جانا تھا اور وضو بھی کرنا تھا۔ جس پر لائن لگی ہوئی تھی۔ میں اس میں مشغول ہو گیا۔ عزیز الٰہی صاحب ادھر ادھر ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب میں وضو کر رہا تھا تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ ''میں مولانا سے ابتدائی ملاقات بھی کر آیا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ خبر و نظر کا وہ کالم کس نے لکھا تھا؟''

''آپ نے کیا کہا۔'' میں نے پوچھا۔

سادگی سے کہنے لگے۔ ''میں نے کہہ دیا کہ یہ آپ ہی کے ایک عزیز یونس حسنی صاحب نے لکھا ہے۔''

مولانا نے سن کر فرمایا ''اس طرح دو علماء کو دو بدو کرنا نامناسب ہے۔''

میں نے سر پیٹ لیا ''عزیز الٰہی صاحب یہ باتیں تو ہم صحافی حکومتوں کو بھی نہیں بتایا کرتے۔ خیر اب آپ مولانا کے پیچھے عشاء پڑھیے میں دلی جا کر پڑھ لوں گا اور میں نے یہی کیا۔ مجھے علم تھا کہ مولانا کی غیرت دینی اور ان کی کسر نفسی نے اس کالم کو مفتی صاحب سے بھی زیادہ ناپسند کیا ہوگا۔

۱۹۶۸ء میں میں پاکستان آ گیا تھا۔ مولانا اس کے بعد کئی بار پاکستان تشریف لائے۔ ایک بار آئے تو ہمارے ایک عزیز سے ملنے آئے۔ اس دن بارش خوب ہوئی تھی اور گلیاں کیچڑ پانی سے بھری تھیں۔ ان عزیز کی پشت پر میرے خسر کا مکان تھا۔ انہوں نے فرمایا ''ہم جعفر بھیا (میرے خسر) سے ملنے جانا چاہتے ہیں۔ ایک اور عزیز جوان کے ہمراہ آئے تھے کہنے لگے آپ وہاں کیچڑ پانی میں کہاں جائیں گے انہی یہیں بلائے لیتے ہیں۔ فرمانے لگے ''نہیں بھئی

جعفر بھیا ہمارے بزرگ ہیں ہم ان سے خود ملنے جائیں گے۔ انہیں بلانے کا کیا مطلب اور ہم تو تکیہ کے رہنے والے ہیں کیچڑ پانی سے گزرنا ہمارے معمولات میں ہے۔''

میں نے دل میں سوچا بڑے آدمی یوں ہی تو نہیں بن جاتے۔

دوسری مرتبہ تشریف لائے تو چند ماہ قبل میری بڑی بیٹی کا انتقال ہوا تھا۔ میری اہلیہ کے پاس تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ وہ ان کی قریبی عزیز ہیں ان سے بڑی دل سوزی اور دلجوئی کی باتیں کرتے رہے اور چند منٹ ان کے پاس بیٹھ کر دوسری جگہ ملنے گئے۔

شاید اسی سفر میں انہوں نے اپنے تمام اعزا کو الفلاح ہال میں جمع کروایا اور ایک بڑی دل گداز تقریر کی جس کا مفہوم کچھ یہ تھا کہ محض حسنی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا اس کے بعد جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں وہ امت کے عوام سے کہیں زیادہ ہیں۔ میرا احساس ہے کہ یہ تقریر مجھ سمیت خاندان کے کسی فرد کے دل کو نہ بدل سکی۔ البتہ مولانا ''پہچانے کے عمل'' کے لیے سیکڑوں گواہ ضرور بنا گئے۔

ایسے ہی ایک سفر میں وہ جامعہ کراچی بھی تشریف لائے۔ آرٹس آڈیٹوریم میں ان کی تقریر تھی۔ آڈیٹوریم میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور دونوں طرف کے بیرونی برآمدے بھی طلبہ سے بھرے ہوئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے علم' اس کی افادیت اور اہمیت پر ایک بڑی پر مغز تقریر کی جو شائع ہو چکی ہے۔ مگر تقریر کا افتتاح تقریر سے زیادہ اہم تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ بعثت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت دنیا بھر خصوصاً عربوں کی جو حالت تھی اس کے پیش نظر اگر کسی شخص سے پوچھا جاتا کہ اس قوم پر پہلی وحی کیا نازل ہوگی تو شاید کوئی یہ نہ بتا سکتا کہ وہ اقراء ہوگی کیونکہ عربوں کے معروف عیوب دوسرے تھے۔ مگر علم پر قرآن نے یہ زور دے کر واضح کر دیا علم تمام عیوب کو دھو ڈالنے والی چیز ہے۔

اس کے فوراً بعد شعبہء عربی میں ان کی تقریر تھی۔ پروفیسر عطیہ خلیل عرب کا اصرار تھا کہ ان کے شعبہ میں تقریر عربی میں کی جائے کیونکہ اس کے چند طالب علم عرب بھی ہیں اور یوں بھی

یہ عربی کا شعبہ ہے مگر مولانا نے جو عطیہ خلیل عرب کو بڑا عزیز رکھتے تھے کہ وہ ان کی استاد زادی ہیں اس کے لیے ہرگز تیار نہ ہوئے فرمایا کہ میں عرب ممالک سے آ رہا ہوں' مجھے عربوں سے جو کچھ کہنا تھا عربی میں کہہ دیا۔ پاکستان والوں سے میں اردو ہی میں مخاطب ہوں گا اور دل کی باتیں کروں گا اور وہ انہوں نے کیں۔

مولانا عربی پر غیر معمولی قدرت کے حامل تھے' اردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ درجنوں کتابوں کے مصنف اور مختلف علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ مگر اللہ نے انہیں گداز قلب سے نوازا تھا وہ ملت اسلامیہ کے لیے دردمندی رکھتے تھے۔ منکسر المزاج' صاف گو' بے باک' حلقہء یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزمِ برحق و باطل میں فولاد کی طرح سخت بن جاتے تھے۔

آخر عمر میں متصوفانہ رجحانات بڑھ گئے تھے۔ بھوپال کے شاہ محمد یعقوب صاحب سے بیعت ہو گئے تھے۔ ان کے ملفوظات بھی مرتب کیے تھے اور اس سلسلہ میں بھوپال آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ مگر ادھر چند سالوں سے سفر ان کے لیے دشوار ہو گیا۔ چند ماہ سے تو گھر پر صاحب فراش تھے۔ عرصے سے خطوط بھی املا کراتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔

ڈاکٹر یونس حسنی

برصغیر کا قابل فخر اثاثہ

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مولانا سید ابوالحسن علی میاں کے سانحہء ارتحال سے مسلم برصغیر بلکہ اسلامی دنیا ایک ایسے عالم دین سے محروم ہوگئی ہے جو ادب، فلسفہ اور عالمی سیاست میں بھی بے پایاں درک رکھتا تھا۔

مولانا ابوالحسن علی میاں نے سب سے پہلے سید احمد شہید پر قلم اٹھایا وہ اس وقت نوجوان تھے۔ سید احمد شہید سے مولانا علی میاں کا نسبی تعلق تھا، سید احمد شید کی تحریک مجاہدین پر متعدد حضرات نے بہت بے بنیاد مفروضات قائم کر رکھے ہیں۔ مثلاً ایک حلقے کا یہ خیال ہے کہ یہ تحریک انگریزوں کی حامی تھی اور پنجاب کی سکھ حکومت کا خاتمہ اس تحریک کا مقصد اولیٰ تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے بہت مستند انداز میں اس غلط اندیشی کا تدارک کیا۔ مولانا علی میاں نے اس غلط اندیشی کے خلاف بہت پہلے ہی قلم اٹھایا تھا۔ علماء کے ایک بڑے حلقے نے اس تحریک کو شاہ ولی اللہی تحریک کی توسیع قرار دیا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا اور پھر خواص خان نے ہزارہ اور مانسہرہ کے تحریکی اکابر کے کارناموں پر روشنی ڈال کر مولانا مہر کے کام کے بارے میں یہ شکایت بھی دور کر دی کہ انہوں نے صوبہ سرحد کے ہندکو علاقے پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی تھی۔ میں ایک عرصے سے مولانا ابوالحسن علی میاں کی تحریریں پڑھتا رہا ہوں، خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبال کی فکر پر مولانا علی میاں کی تصنیف ''نقوشِ اقبال'' لائق صد داد ہے۔ یہ اقبال کے کلام کی دل پسند تشریح نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں تصوف وسلوک کے جس میلان کی کارفرمائی ہے اور عالم اسلام کے اتحاد کے لیے علامہ کی

بھرپور مساعی کا ایک ایسا رخ سامنے آتا ہے جو علامہ کی زندگی اور شاعری کا ایک مہتم بالشان رخ ہے۔

مولانا علی میاں کے دادا سید فخر الدین خیالی اپنے وقت کے روشن ضمیر مصنف اور شاعر تھے اور والد بزرگوار حکیم عبدالحئی بھی ادب سے بے پناہ شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے نزہۃ الخواطر جیسی آٹھ جلدوں میں معرکۃ الآرا تصنیف کے علاوہ جسے برصغیر کی ثقافتی، سیاسی اور تمدنی تاریخ کہا جاسکتا ہے کے بعد اردو ادب کی تاریخ و تذکرہ ''گل رعنا'' بھی تصنیف کیا۔ حکیم عبدالحئی کی اہمیت دینی اور ادبی حلقوں پر بخوبی روشن ہے۔ مولانا علی میاں نے اپنی خاندانی روایت کو آگے بڑھایا اور وہ اقبال پر ایک ایسی اہم تصنیف کے مصنف ہیں جو اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوئی۔

وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک ادبی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی اور دینی عالم کم از کم گزشتہ ۶۰۔۵۰ سال میں ادب اور تحقیق کے میدان سے اس درجہ متعلق رہا ہو کہ وہ نہ صرف برصغیر میں بلکہ پوری اسلامی دنیا میں عربی ادب اور تحقیق کے شعبے کے متبحر عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔

مولانا علی میاں نے عربی کے مشہور استاد مولانا خلیل عرب اور مراکش کے ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ان کی والدہ سیدہ خیر النساء حافظہ قرآن، شاعرہ اور مصنفہ تھیں اور آپ کی بہن امت اللہ تسنیم نے شعبہ حدیث میں زادِ راہ (ترجمہ ریاض الصالحین عربی) تصنیف کی۔ اس طرح مولانا علی میاں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ''یہ خانہ ہمہ آفتاب است''۔

مولانا کی پہلی اردو کتاب سیرت سید احمد شہید ہے۔ اس کتاب کی تعریف و توصیف میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا سید حسین احمد مدنی پیش پیش تھے۔ مولانا علی میاں نے عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا علی قاسمی کی کتاب ''مولانا ابوالحسن علی ندوی مشاہیر

امت کی نظر میں'' طبع ہو چکی ہے اور ایک نوجوان عربی اسکالر عبدالماجد الغوری الندوی کی کتاب ''ابوالحسن علی الحسینی الندوی الامام المفکر والداعی الادیب'' کی تصنیف بھی قابل داد ہے۔تازہ ترین کتاب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی میر کارواں ہے۔

مولانا کی تصانیف کی تعداد ۱۷۶ ہے۔ایک نوجوان ندوی مصنف طارق زبیر نے مولانا کی تصانیف کی ایک فہرست گزشتہ سال شائع کی ہے۔مولانا کی مشہور ترین تصنیف ''ماذا اخسر العالم بانحطاط المسلمین'' جس کا اردو ترجمہ مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا۔عربی اصل سے قبل چھپ چکا تھا۔ جو مولانا ہی کے قلم سے تھا۔مولانا کی دوسری اہم کتاب حوالہ تاریخ دعوت وعزیمت ہے جو سات جلدوں اور چھ اجزا میں لکھنو اور کراچی سے شائع ہوئی ہے۔سوانحی خاکہ نگاری کے باب میں مولانا کی تصنیف ''پرانے چراغ'' نے اردو ادب کے بیشتر نقادوں سے داد وصولی ہے۔

برصغیر کے کسی عالم کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا کہ وہ عرب دنیا میں اسلام کے بارے میں قابل رشک سند کا درجہ حاصل کر سکے۔

مجھے ان کی جس تصنیف نے بطورِ خاص متاثر کیا وہ ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' ہے۔اس کتاب میں انہوں نے مولانا مودودی کی کتاب ''تجدید واحیاء دین'' میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید پر تصوف کے حوالے سے گرفت پر گرفت کی ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ مولانا مودودی دوسرے علما پر بڑی بے باکی سے تنقید کرتے ہیں لیکن ان کی جماعت کے ''ارکان ورفقاء میں بانی جماعت کے لیے تقدس کی حد تک تعظیم اور اس پر ہونے والی تنقیدات واعتراضات کے خلاف بڑی ذکاوت پائی جاتی ہے۔''

حق تو یہ ہے کہ یہ وہ اعزاز ہے جس نے پورے برصغیر کو مفتخر کیا۔ہوتا آیا ہے کہ ایک روشن دماغ پورے علاقے کے لیے عزت وتوقیر کماتا ہے۔مولانا علی میاں کے تبحر علمی کی وجہ سے عرب علماء میں یہ احساس پیدا ہوا کہ عربی زبان میں مہارت اور عربی ادب کے معاملے میں

ایک منتہی کی سی نظر غیر عرب کے حصہ میں بھی آ سکتی ہے۔ ہمارے علم کو مولانا علی میاں کے ذریعے عرب دنیا میں جو عزت و وقار ملا اس کی حیثیت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مولانا علی میاں اور علامہ عبدالعزیز یمنی نے عرب دنیا میں برصغیر کا نام اس قدر اونچا کیا ہے کہ اگر ہمارے یہاں کے نوجوان عربی داں ان دونوں بزرگوں کو نمونہ تقلید قرار دے کر آگے بڑھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس خلا کو پورا نہ کر سکیں جو سردست ایک تکلیف دہ حقیقت کے طور پر پیدا ہو چکا ہے۔

آج جرمن اور برطانوی یونیورسٹیوں میں اس حقیقت کا سوگ منایا جا رہا ہے کہ اب ان درسگاہوں کو عربی میں وہ تفوق حاصل نہیں رہا جو انہیں سو سال پیشتر یا بیسویں صدی کے نصف اول تک حاصل تھا' ہمارے یہاں بھی صورتِ حال بہت زیادہ امید افزا نہیں ہے ہر چند کہ ہمارے ملک کا اوڑھنا بچھونا اسلام ہے' بلکہ ہمارے یہاں تو اس زبان سے بھی حیرت ناک حد تک غفلت برتی جا رہی ہے جس نے اسلامی علوم کی حد تک عربی کی جگہ لے لی ہے اور جو مملکت کی زبان ہونے کے آئینی وعدہ پر اتراتی رہتی ہے۔

مولانا علی میاں نے سعودی عرب کے فیصل ایوارڈ اور متحدہ عرب امارات کے سب سے بڑے انعام کے کروڑوں روپیوں کو دینی کاموں پر صرف کر کے اور اپنے ذاتی استعمال کے لیے ایک پیسے پر بھی اپنا حق نہ رکھ کر ثابت کر دکھایا تھا کہ سچا عالم اپنے مثالیوں کی دنیا کی تعمیر کے لیے سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ ہم نے فی زمانہ مولانا علی میاں کے علاوہ کتنے ایثار پسند علماء پیدا کیے ہیں؟

صرف یہی نہیں مولانا علی میاں نے اسلام میں فرقہ پرستی کے خلاف محاذ قائم کیا۔ وہ اہل توحید حنفی اور وہابی کی تفریق سے بھی دور رہے۔ انہوں نے تصوف اور شریعت کے درمیان خلیج میں اضافہ کرنے کی ہر کوشش کی مخالفت کی۔ آزادی کے بعد کے ہندوستان میں مولانا علی میاں نے اسلام کی ایک ایسی تاویل کو شعار بنایا جو اتحاد بین المذاہب والمسالک کا بہترین نمونہ تھی

اور شاید اسی لیے ان کی وفات حسرت آیات نے برصغیر کے طول وعرض میں ایک ایسا تاثر پیدا کیا جو بہت کم دیکھنے اور سننے میں آیا۔

میرے حلقہ دوستان میں جملہ مکاتب فکر کے احباب شامل ہیں۔ میں بڑے وثوق سے یہ اعتراف حقیقت کرنا چاہتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسا حلقہء خیال ہو جس میں مولانا علی میاں کی وفات علمی میراث کے بہت بڑے وارث کی وفات تسلیم نہ کی گئی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جو بہت مشکل سے ملتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ جیسے علماء کی وفات کے بارے میں بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ

موت العالِم موت العالَم

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ایک عہد ساز شخصیت

بیسویں صدی کے آخری غروب آفتاب سے صرف چھ گھنٹہ قبل ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر کی ایک چھوٹی سی بستی تکیہ میں ایک آفتاب علم و ہدایت غروب ہوگیا۔ یہ دسمبر ۹۹۹ء کی ۳۱ تاریخ تھی اور برصغیر میں رمضان ۱۴۲۰ھ کی ۲۲ تاریخ اور یہ آفتاب علم و ہدایت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تھے' جو برصغیر میں حضرت مولانا علی میاں بلکہ صرف علی میاں' عرب ممالک میں مراکش سے لے کر کویت تک اور اسی طرح ترکی' ایران' انڈونیشیا وغیرہ میں شیخ ابوالحسن کے نام سے مشہور تھے۔ عربوں میں کنیت احترام و محبت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اس خاکسار راقم الحروف کو مکہ مکرمہ سے آنے والے ٹیلیفون سے ایک دوست کے ذریعہ رحلت سے صرف ساڑھے تین گھنٹہ بعد یہ اطلاع ملی تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک روشنی تھی جو چلی گئی' اندھیرا ہوگیا۔

اک ''روشنی'' تھی ساتھ گئی آفتاب کے

مولانا کی رحلت سے صرف ہندوستان ہی ان کی روشنی ہدایت سے محروم نہیں ہوا بلکہ سارا عالم اسلام بلکہ پوری دنیا اس روشنی سے محروم ہوگئی ہے۔ اس لیے مولانا مرحوم سے محبت کرنے والے ان کی پرمغز و پرنور تحریروں سے فیض یاب ہونے والے دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہیں۔ اس اندوہ ناک سانحہ ارتحال پر یقیناً مشرق و مغرب میں لاکھوں آنکھیں اشک بار ہوں گی بلکہ برسوں اشکبار رہیں گی۔

جان کر منجملہ خاصانِ مے خانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

یقیناً سید احمد شہید یا شہید بالاکوٹ کے یہ جانشین خاصانِ خدا میں تھے۔ اگر جگر مرحوم اپنے آخری دور کی اس غزل میں غالب کا انداز:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اختیار نہ کرتے تو اور حیات ہوتے تو اس وقت مولانا کی زبان میں کہتے۔

جان کر منجملہ خاصانِ بیت اللہ مجھے　　مدتوں رویا کریں گے منبر و مسجد مجھے

اور اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم خاصانِ بیت اللہ میں سے تھے کیونکہ آپ کو ۱۸ دسمبر ۱۹۹۶ء (۶ شعبان ۱۴۱۷ھ) کے دن بیت اللہ میں وہ اعزاز ملا جو چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں اس وقت تک کسی کو نہیں ملا تھا اور وہ اعزاز یہ تھا کہ اس روز حضورؐ کی طرف سے مقرر کردہ کعبہ کے کلید بردار خاندان شیبی کے موجودہ کلید بردار شیبی صاحب نے آپ کو کعبہ کی کنجی پیش کی کہ آپ رابطہ عالم اسلامی کے ان ممبران کے لیے جن کو اس کی ایک ذیلی کمیٹی کے اجلاس کے موقعہ پر کعبہ میں داخل ہونے کا پروانہ یا اجازت نامہ ملا تھا' ان کے لیے آپ کعبہ کا دروازہ کھولیں' اب تک یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والوں کے لیے خواہ وہ کتنے ہی معزز مہمان' شاہانِ وقت یا سربراہانِ مملکت ہوں ان کے لیے درِ کعبہ خود خاندان شیبی کے کلید بردار کھولا کرتے تھے لیکن اس موقعہ پر شیبی صاحب نے جو مولانا مرحوم کے ساتھ سب سے پہلے سیڑھی پر اوپر چڑھے تھے بلکہ نقرس (Gout) کے مریض مولانا کو سہارا دے کر سیڑھی سے اوپر لے گئے تھے' اوپر جا کر انہوں نے درِ کعبہ کی چوکھٹ پر کعبہ کی چابی رکھ دی اور اشارہ کر کے فرمایا ''انت شیخ العالم و شیخ الحرم ایضا' افتح الباب بیدک نتبرک'' (آپ دنیا کے شیخ اور حرم شریف کے بھی شیخ ہیں' اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولیے تاکہ ہم برکت حاصل کریں) مولانا مرحوم نے یہ مقدس امانت اپنے ہاتھ میں لے کر کعبہ کا دروازہ کھولا اور سب سے پہلے آپ ہی اندر داخل ہوئے۔ پھر شیخ شیبی اور دوسرے مہمان۔ کعبہ کے اندر سابق فرماں روا شاہ سعود بن عبدالعزیز کے پوتے شہزادہ مشعل بن محمد بن سعود نے مولانا مرحوم سے

درخواست کی کہ آپ دعا کرائیں' آپ نے دو رکعت نفل پڑھ کر دعا کرائی' جس میں شیخ شیبی اور دیگر اندر داخل ہونے والے معزز مہمان آمین کہتے رہے۔

مولانا مرحوم نے اپنی آپ بیتی کاروان زندگی کی جلد ششم میں اس عظیم خدائی اعزاز کا ذکر اپنے مخصوص متواضعانہ انداز میں اس طرح کیا ہے۔

''یہ شرف وسعادت جو اس ناچیز گناہ گار کو حاصل ہوئی' اس کا مقابلہ دنیا کے بڑے بڑے اعزاز نہیں کر سکتے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

(کاروانِ زندگی ٦:٣٣٩)

مولانا مرحوم کے بعض عقیدت مندوں نے ٹیلیفون سے اس کی اطلاع لکھنؤ' انڈیا کے ایک صحافی کو کر دی تھی اور دوسرے روز ١٩ دسمبر ١٩٩٦ء کو اس خبر کو انڈیا کے مشہور انگریزی اخبار Hindustan Times نے اپنے پہلے صفحہ پر نمایاں طور پر شائع کیا اور قومی آواز لکھنؤ نے کافی تفصیل کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا ایک مفصل رپورٹ کے ساتھ۔ (١)

مولانا اس سے قبل متعدد بار کعبہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل کر چکے تھے اور پہلی بار یہ سعادت ١٩٥٠ء کے حج میں حاصل ہوئی تھی' اس وقت خاندان شیبی کے کلید بردار شیبی صاحب نے از خود مولانا مرحوم کو کعبہ میں داخلے کی دعوت دی تھی اور اس کی بھی اجازت دی تھی کہ جن لوگوں اور ہمراہیوں کے ساتھ لانا چاہیں ان کو لا سکتے ہیں۔ مولانا کے مرشد حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ (مدفون پنجاب' پاکستان) اور ان کے قافلہ کے لوگ سب مولانا کے ساتھ کعبہ میں داخل ہوئے تھے۔ (٢)

خاکسار راقم الحروف حج کی ادائیگی کے فوراً بعد شدید بیمار تھا' اس لیے اس کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی تھی اگرچہ اس نے اپنا پہلا یہ حج مولانا مرحوم کی معیت میں انہی کے انتخاب سے کیا تھا اور مسجد الحرام سے مولانا مرحوم کا جو تعلق ان کے پہلے حج ١٩٤٧ء میں قائم ہوا تھا وہ آخری سال وفات تک قائم رہا اور جب سے رابطہ عالم اسلامی Muslim World League

اور مدینہ منورہ کی اسلامک یونیورسٹی کا قیام ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا تھا اور مولانا مرحوم ان دونوں اداروں کے فاؤنڈر ممبر مقرر ہوئے تھے اور اسی طرح رابطہ کی دوسری ذیلی کمیٹیوں کے ممبر ہوئے تب سے تو وہ ہر سال بلکہ سال میں دو تین بار مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تھے۔

مسجد حرام اور کعبۃ اللہ سے مولانا کے تعلق کی نوعیت کی یاد مجھے ان کے انتقال سے چند دن قبل خاص طور پر اس وقت آئی تھی جب میں رات کو ساڑھے دس بجے سے مکہ مکرمہ کی تراویح میں (P.T.V کے Live پروگرام میں) قرآن کریم سن رہا تھا اور اس وقت بھی ہزاروں انسان وسیع و عریض مطاف میں پروانہ وار طواف کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے مجھے ۱۹۵۰ء کے وہ لمحات یاد آئے جب میں مولانا مرحوم کے ساتھ حرم شریف کے صحن میں بچھی ہوئی باریک کنکریوں (۳) (حصوہ) پر بیٹھا ہوتا تھا اور مولانا طواف کرنے والوں کے جھرمٹ میں کعبہ کو دیکھتے ہوئے اپنے اس ناچیز شاگرد سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھتے تھے۔

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد ست　　عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد ست

سچ ہے کہ جب تک کعبہ آباد ہے قیامت نہیں آئے گی۔

جہاں تک مسجد حرام کے منبر کا تعلق ہے تو اس سے ایک بار حج سے صرف دو تین دن قبل لاکھوں حجاج کو خطاب کرنے کی سعادت بھی صرف مولانا مرحوم ہی کو ۱۹۶۳ء کے حج میں ملی۔ (۴)

یہ تو حرم مکہ اور اس کے منبر کا ذکر تھا، دنیا کی اور مساجد اور ان کے منابر مولانا مرحوم کو یاد کر کے جہاں انہوں نے طول طویل سیاحتوں میں مالیزیا سے لے کر امریکہ تک اور یمن و سوڈان سے لے کر شمال میں لندن تک نمازیں پڑھیں اور خطبے دیے وہ مساجد اور منابر بھی مولانا مرحوم کو یاد کر کے روئیں گے۔

مولاناؒ سے میرا تعلق ۲۰ سال کی عمر میں ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا اور مرحوم کی وفات تک یعنی ۵۳ سال یہ تعلق قائم رہا شروع کے چند برسوں میں یہ تعلق قربت جسمانی کے ساتھ جلوت و

خلوت میں لکھنؤ رائے بریلی، مکہ مکرمہ مدینہ منورہ دمشق میں قائم رہا اور برابر مراسلت بھی رہی، پھر جب ۱۹۶۱ء میں انگلینڈ کے زمانہ قیام میں میں نے پاکستانی نیشنیلٹی اختیار کر لی تو زیادہ تر یہ تعلق مراسلاتی رہا لیکن پھر بھی مکہ مکرمہ اور ریاض کی یونیورسٹی میں میری ملازمت کے دوران مولانا سعودی عرب تشریف لائے تو میری دعوت قبول کی اور میرے مکان پر کھانا تناول فرما کر میری عزت افزائی کی۔ یادوں کا ایک قیمتی خزانہ ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ان کو عنقریب قید تحریر میں لاؤں گا۔ ضروری ہے کہ اس وقت مولانا کے کچھ حالات زندگی قارئین کی نذر کروں۔

خاندان:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم سیدنا حسنؓ کی ذریت میں سے تھے۔ اسی لیے اپنے آپ کو حسنی لکھتے تھے۔ مولانا مرحوم کا شجرۂ نسب عبداللہ الاشتر بن محمد النفس الزکیہ کے ذریعہ سیدنا حسنؓ سے ملتا ہے۔ مولانا مرحوم کے دو اجداد نے موجودہ پاکستان کی سرزمین پر صدیوں قبل اپنے خون کی قربانی دی ہے اسی لیے پاکستان مولانا مرحوم کو ساری خرابیوں کے باوجود بہت عزیز تھا۔ ایک تو یہی عبداللہ الاشتر جو سیدنا حسن کے پوتے عبداللہ المحض کے پوتے تھے۔ یہ عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور کی خون آشام تلوار سے بھاگ کر ۱۴۵ھ میں سندھ کی سرزمین آئے تھے۔ ان کے والد محمد النفس الزکیہ اسی سال مدینہ منورہ میں منصور کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔

منصور نے عبداللہ الاشتر کا پیچھا سندھ میں بھی نہ چھوڑا۔ سندھ کے عباسی گورنر سے لڑتے ہوئے وہ شہید ہوئے اور ان کے جاں نثار رفقاء نے بے حرمتی کے خوف سے ان کی لاش دریائے سندھ میں بہادی تاکہ عباسی لشکر ان کا سر کاٹ کر عراق نہ لے جائے اور وہ کوچہ و بازار میں گشت نہ کرایا جائے۔ (کلفٹن میں ساحل سمندر پر موجود مزار میں مدفون شخصیت کو عبداللہ الاشتر کہنا سراسر غلط ہے۔ (۵)

ان جد اعلیٰ کے بعد مولانا کے دوسرے جد امجد سید احمد شہید ہیں جنہوں نے رائے بریلی سے اپنے مجاہدین رفقاء (مریدین) کے ساتھ براہ سندھ و افغانستان ۱۸۲۶ء میں سرحد (NWFP) آ کر علم جہاد بلند کیا اور موجودہ پاکستان کے اس شمالی صوبہ اور اس کے صدر مقام پشاور کو سکھوں کی غلامی سے آزاد کرایا اور وہ بالاکوٹ میں ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

سید احمد شہید نے سرحد میں برصغیر پر انگریزوں کے تسلط کے بعد کلکتہ و دہلی میں ان کے ہوتے ہوئے ایک صحیح اسلامی حکومت قائم کر دی تھی اور سرحد میں وہ امیر المومنین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔

یہ تو مولانا مرحوم کے خاندان کے شہیدوں کا ذکر تھا لیکن برصغیر میں مولانا کی خاندانی بنیاد ساتویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں پڑی جب آپ کے خاندان کے ایک عالم و مجاہد امیر کبیر سید قطب الدین اپنی جماعت کے ہمراہ فتنۂ تاتار کے زمانے میں بغداد سے براہ غزنی ہندوستان آئے جو اس پر آشوب زمانے میں عراق، ایران اور ماوراء النہر کے مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ تھا۔ سلطنت دہلی کے دروازے ان ستم رسیدہ مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ شیخ قطب الدین کچھ عرصہ دہلی میں شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز رہے پھر انہوں نے نواح الہ آباد قلعہ کڑہ اور مانک پور شہر فتح کیا، ہندوستان میں اس وقت تحریک جہاد قائم تھی، سلطان دہلی نے ان کو یہ علاقہ جاگیر میں دے دیا، جہاں وہ اور ان کے احفاد و اولاد کئی صدی آباد رہے۔ طبقاتِ ناصری اور تاریخ فیروز شاہی میں ان سید قطب الدین کا ذکر ہے۔

گیارہویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں اس خاندان کے ایک بزرگ کڑہ مانک پور سے آ کر رائے بریلی شہر کے باہر دریائے سی کے کنارے آباد ہوئے ان بزرگ کا نام شاہ علم اللہ تھا، اور وہ مشہور صوفی بزرگ سید آدم بنوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ اگرچہ ان کا ارادہ مکہ مکرمہ ہجرت کا تھا لیکن اپنے مرشد کے اشارے پر اس ویران جگہ آ کر آباد ہوئے۔ اپنے اور اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھ سے ایک چھوٹی سی مسجد بنائی۔ یہ مقام تکیہ

(خانقاہ) کے نام سے مشہور ہوا عالمگیر نے ۱۶۷۳ء میں شاہ علم اللہ کو ایک جاگیر کی پیش کش کی لیکن آپ نے قبول نہیں فرمائی اور زہد وفقر اور علم وفضل کی زندگی کو پسند کیا۔ شاہ علم اللہ کی بنائی ہوئی بے مینار کی یہ مسجد آج بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ اگرچہ چند سال قبل اس میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے کچھ توسیع کی گئی ہے۔

شاہ علم اللہ کے اس خاندان میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں سید احمد شیدؒ پیدا ہوئے ان کے عہد میں تکیہ اور رائے بریلی کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ اس سے قبل کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ سید احمد شہید نے مشیخت وتصوف اور روحانیت وللّٰہیت کے ساتھ اس خاندان میں جہاد کی سنت کو زندہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رنجیت سنگھ نے پنجاب وسرحد پر قبضہ کر کے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر دی تھی اور بہت سی مساجد منہدم کر دی گئی تھیں یا ان میں اذان بند کر دی گئی تھی۔ دہلی کی کمزور وناتواں مغلیہ حکومت جو درحقیقت انگریزوں کے تابع تھی کفر کی اس چیرہ دستی کے خلاف بے دست وپا تھی۔ سید احمد شہیدؒ جنہوں نے جوانی میں لکھنؤ میں اور پھر ٹونک کے مسلمان ریاست میں سپہ گری کی تربیت حاصل کی تھی اور وہ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بیعت ہو کر ان کے چھوٹے بھائی مترجم ومفسر قرآن شیخ عبدالقادر دہلوی سے روحانی تربیت حاصل کر چکے تھے اور خود ان کا اپنا فیض انیسویں صدی کی ابتدا میں تکیہ رائے بریلی میں جاری تھا۔ دینداری کی ایک بادِ بہاری ان کے ذریعہ شمالی ہند میں چل رہی تھی۔ انہوں نے حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد اپنے ہزاروں مریدوں کے ساتھ سرحد میں علم جہاد بلند کیا۔ سکھوں سے اسے آزاد کرایا اور پھر اپنوں کی غداری سے وادی کاغان کے علاقے بالاکوٹ میں اپنے رفقاء کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا۔

سید احمد شہید کی شہادت کے ۸۳ سال بعد اس خاندان میں ۱۹۱۴ء میں جو بچہ پیدا ہوا اور جو نو سال کی عمر میں یتیم ہو گیا جس نے بڑا ہو کر اس خاندان کا نام ساری دنیا میں روشن کیا اس کا نام علی رکھا گیا تھا۔ وہ دنیا میں ابوالحسن علی ندوی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے اپنی ایمان

افروز تحریروں اور اپنے نفس گرم اور سوزِ دل سے عرب وعجم اور مشرق ومغرب میں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں ایمان کا چراغ روشن کیا۔

حضرت مولانا علی میاں کے دادا مولانا فخر الدین ایک ممتاز مصنف اور شاعر تھے' خیالی تخلص کرتے تھے' انہوں نے شعراء وادباء کا تذکرہ مہر جہانتاب کے نام کے ساتھ لکھا' مولانا مرحوم کے والد حکیم عبدالحئی صاحب مشہور ادیب' نقاد اور اردو عربی کے ایک مایہء ناز مصنف تھے' ان کی اردو ادب کی تاریخ ''گل رعنا'' ادبی حلقوں میں مشہور ہے اور عربی میں برصغیر کے علماء' شعراء' ادباء' سلاطین' وزراء' اطباء' فلاسفہ اور دیگر ماہرین فن وہنر کی تاریخ عربی میں نزھۃ الخواطر کے نام سے ۸ جلدوں میں کافی پہلے دائرۃ المعارف' حیدر آباد دکن سے چھپی تھی جو عالم عرب میں مشہور ہے۔ مسلمانوں کی یہ منفرد تہذیبی ثقافتی تاریخ چند ماہ قبل دمشق میں دوبارہ تین بڑے سائز کی جلدوں میں چھپی ہے اور دیگر کتابیں بھی عرب ممالک اور ہندوستان میں چھپی ہیں۔

مولانا مرحوم کی والدہ سیدہ خیر النساء حافظہء قرآن اور شاعرہ تھیں۔ بہتر تخلص کرتی تھیں' خواتین کے لیے انہوں نے حسنِ معاشرت کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ مولانا مرحوم کی ایک بڑی بہن بھی مصنفہ تھیں۔ انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب ریاض الصالحین کا ترجمہ زادِ راہ کے نام سے کیا جو برسوں سے مقبول عام ہے اور کراچی میں دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس طرح ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' کی بات مولانا مرحوم کے خاندان پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

تعلیم وتصنیف

مولانا مرحوم کی تعلیم وتربیت ان کی قدسی صفات والدہ اور نیک نفس اور پاک باز بھائی ڈاکٹر مولوی عبدالعلی' ایم بی بی ایس کے زیر سایہ ہوئی۔ مولانا کو عام روش کی تدریس وتعلیم کے برخلاف ایک ایک علم کی علیحدہ علیحدہ تعلیم دی گئی۔ پہلے عربی زبان وادب پھر قرآن وتفسیر پھر حدیث وفقہ اور یہ تعلیم انہوں نے اپنے زمانے کے اساتذہ فن سے حاصل کی۔ عربی زبان بچپن

سے گھٹی میں پڑی تھی۔ انہوں نے چودہ سال کی عمر میں اپنے پھوپھا پروفیسر محمد طلحہ صاحبؒ پروفیسر عربک اورینٹل کالج لاہور کے ساتھ علامہ اقبالؒ سے ملاقات کی اور بتایا کہ انہوں نے اقبال کی نظم ''چاند'' کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ تو اقبالؒ نے عربی میں اس بچہ سے سوال کیا یہ جاننے کے لیے کہ کیا واقعی اتنی اچھی عربی جانتا ہے۔ اقبال چودہ سال کے اس بچہ کے جوابات اور معلومات جان کر بہت ہوئے۔

سولہ سال کی عمر میں مولانا نے عربی زبان میں ایک رسالہ سید احمد شہیدؒ پر لکھا جو مصر کے ایک مشہور عالم شیخ رشید رضا نے چھاپا۔ پھر پچیس سال کی عمر میں مولانا مرحوم نے سید احمد شہید پر اردو میں ایک کتاب لکھی جس نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی' سید سلیمان ندوی اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے علماء سے خراج تحسین حاصل کیا اور انہوں نے اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کیے۔

اس طرح مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز بچپن اور ابتدائے جوانی سے ہو گیا تھا۔ اپنے خاندانی اثرات کی وجہ سے مولانا مرحوم کا دل اسلام کی دعوت' اس کے لیے دردمندی اور بے قراری سے معمور تھا۔ اسی لگن نے ان کو مولانا مودودیؒ سے قریب کیا۔ وہ سن ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک لکھنؤ کی جماعت اسلامی کے امیر رہے۔ اس دوران ان کا تعلق مولانا محمد الیاس سے ہوا جنہوں نے اسلاف کے طریقہ پر میوات کے علاقے میں تبلیغ کا بڑی بے نفسی اور بے لوثی سے کام کیا تھا۔ مولانا نے ان کے دل میں اسلام کے لیے صحابہ جیسی تڑپ اور بے قراری پائی اور مولانا مودودیؒ کے مشورے سے مولانا یکسو ہو کر مولانا الیاس کی دینی دعوت یا تبلیغ سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا الیاس کی للّٰہیت وانابت الی اللہ اور زہد واتقاء اور جذبہء ایمانی نے ان کو بہت متاثر کیا اور مولانا نے ان کی سیرت پر ایک کتاب☆ ''مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی

☆ (''مولانا مودودی کے مشورے سے یکسو'' ہونے سے مراد اگر مشورے سے بے نیاز ہونا ہے تو صحیح ہے لیکن مشورہ بمعنی اجازت درست نہیں کیونکہ حضرت علی میاں مولانا مودودی صاحب کی اجازت سے نہیں بلکہ ان سے اختلاف کی بنا پر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تھے۔ راقم نے دیباچہ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ تفصیل کے لیے حضرت علی میاں کی خودنوشت سوانح (کاروانِ زندگی'' کی جلد اول کا مطالعہ فرمائیں۔ (مرتب)

دعوت'' لکھی جو ۱۹۴۷ء سے قبل چھپی۔

مولانا مرحوم ۲۱ سال کی عمر میں ندوہ میں عربی ادب اور تفسیر کے استاد مقرر ہو گئے تھے لیکن ساتھ ہی وہ مولانا مودودیؒ اور پھر مولانا الیاس کی تبلیغی تحریک میں کافی متحرک رہے اور اس کے بعد مولانا نے جو تصنیفات عربی اور اردو میں لکھیں ان کا انداز مولانا مودودیؒ اور عربی مدارس کے علماء و مصنفین سے جدا تھا۔ ان تصنیفات کا امتیازی وصف گہری تحقیق' وسیع نظر اور سوزِ دروں کے ساتھ اصلاحی پیغام تھا' یہ امتیازی اوصاف مولانا کی شہرۂ آفاق عربی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین میں موجود ہیں' یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ ''مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا'' ۱۹۴۷ء میں عربی اصل سے تین سال قبل چھپا۔

عربی اصل کتاب مصر کے ایک مشہور علمی ادارے کی طرف سے ۱۹۵۰ء میں چھپی اور اپنے اچھوتے عنوان کی وجہ سے اس نے جلد ہی عرب مصنفین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ عرب ممالک میں اس کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کی وجہ سے مولانا اپنے مصر' سوڈان' اردن اور دمشق کے سفر میں بہت مقبول و معروف ہوئے۔ اس کتاب کے دسیوں قانونی اور غیر قانونی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور عرب ممالک کی بہت سی یونیورسٹیوں میں یہ ریفرنس کی کتاب ہے۔ سید قطب شہید جیسے عظیم مصنف نے اس کی تعریف میں ایک طویل مقدمہ لکھا ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں انگلش' فرنچ' جرمن' اٹالین' انڈونیشی' ترکی' فارسی وغیرہ میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں ان کا نام ہے Islam and the World۔

مولانا مرحوم کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ایک نوجوان ندوی مصنف طارق زبیر نے مولانا کی عربی تصنیفات کی تعداد ۷۶ اور اردو تصنیفات کی تعداد ۲۶۸ بتائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی بہت سی عربی کتابوں کے اردو تراجم شائع ہوئے ہیں اور بہت سی اردو کتابوں کے عربی تراجم شائع ہوئے ہیں۔ اس لیے کتابوں کی یہ تعداد ہے' جن میں

چھوٹی بڑی سب کتابیں یعنی کتابیں اور مختصر رسائل شامل ہیں۔ مذکورۂ بالا ندوی مصنف کی کتاب کا نام سماحة الداعية المجاهد الامام ابوالحسن علی الحسنی الندوی ومولفاته العربية ہے جو ۱۹۹۸ء میں انڈیا میں چھپی ہے۔

ان میں مشہور کتاب ماذا خسر العالم کے علاوہ تاریخ دعوت وعزیمت (اردو چھ اجزاء سات جلدیں) ایک حوالہ کی انتہائی وقیع کتاب ہے۔ اس میں ان اہم شخصیات کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے جنہوں نے مختلف ادوار میں اسلام کے جسم میں نئی روح پھونکی اور اعلیٰ فکری اور روحانی کارنامے انجام دیے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ۴ جلدوں میں دمشق میں چھپی ہے۔ ایک اہم کتاب اسلام کے بنیادی ارکان پر ''ارکان اربعہ'' کے نام سے ہے۔ یہ بھی عربی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ یہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے موضوع پر ایک تفصیلی اور تحقیقی کتاب ہے اور تاریخ دعوت وعزیمت کی طرح کافی مقبول ہے۔ ایک اور فکر انگیز اور مفید کتاب ''مسلم ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش'' ہے جو اپنے تجزیاتی اور تنقیدی اسلوب کی وجہ سے بڑی مقبول ہوئی ہے۔

پرانے چراغ (۳ جلدیں) ان شخصیات کی سوانح خاکے ہیں جن سے مولانا کا تعلق رہا، یہ کتاب اردو ادب کا بھی ایک شہ پارہ ہے۔ مولانا مرحوم کی دلآویز اور اثر انگیز اردو تحریر کی تعریف ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مرحوم اور آل احمد سرور جیسے نقادانِ فن نے کی ہے۔ سات جلدوں میں مولانا مرحوم کی آپ بیتی ''کاروانِ زندگی'' آپ بیتی ہی نہیں بلکہ برصغیر اور عالم عرب کی ایک دینی، اجتماعی، سیاسی اور فکری تاریخ اور معلومات کا ایک خزانہ ہے۔

جہاں تک مولانا مرحوم کی عربی تحریر، اس کی شگفتگی، دلآویزی اور اثر انگیزی کا تعلق ہے۔ اس پر مصر وشام اور سعودی عرب وعراق ومراکش وغیرہ کے ادباء یکساں طور پر رطب اللسان ہیں، مولانا کی کتاب ''مختارات'' جو عربی کے نثری ادب کا انتخاب ہے۔ بعض عرب ممالک کے انٹر کالجوں میں داخل ہے اور ادبائے عرب کا اتفاق ہے کہ یہ عربی ادب کا بہترین مجموعہ

Anthology ہے۔افسوس ہے کہ درس نظامی کو پڑھنے والے عربی مدارس اس کتاب سے اپنے تعصب کی وجہ سے محروم ہیں اور پس درجہ کی کتابیں نفحتہ الیمن و نفتحہ العرب پڑھاتے ہیں۔مولانا نے یہ کتاب ندوہ کے طلبہ کے لیے ۱۹۴۳ء میں لکھی تھی اور اس نے ندوہ سے سینکڑوں عربی ادیب پیدا کیے ہیں۔مولانا مرحوم کی عربی تحریر کی دلکشی اور جمال پوری آب وتاب کے ساتھ ''روائع اقبال'' میں دیکھا جا سکتا ہے جو ناچیز راقم الحروف نے دمشق یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے دوران ۱۹۵۷ء میں دمشق کے مشہور اشاعتی ادارے دارالفکر سے چھپوائی تھی اور پھر متعدد بار چھپی' یہ علامہ اقبال کی بعض شاہ کار نظموں اور غزلوں کا عربی ترجمہ ہے۔عالم عرب میں علامہ اقبال کی شاعری اور فکر کا اس سے بہتر تعارف کسی نے نہیں کرایا ہے۔علامہ اقبال کا شعر:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مسجد قرطبہ کے ساتھ خود ان کے فکری عمل پر صادق آتا ہے اور اسی طرح مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکری تخلیقات پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ مولانا کی نثری اور اقبال کی شعری کاوشوں کا منبع دونوں کا زندہ و متحرک ایمان' نفس گرم' جذب دروں اور عشق اسلام و عشق رسول ہے۔

مولانا مرحوم کی تحریروں کو عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں جو مقبولیت بیسویں صدی کی آخری تہائی میں حاصل ہوئی وہ کسی ہندوستانی یا پاکستانی مصنف بلکہ کسی عرب مصنف کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔سید قطب کی تصنیفات ضرور بہت مقبول ہیں لیکن وہ صرف بیشتر عالم عرب میں۔برصغیر میں بہت کم لوگ ان سے فیض یاب ہوئے ہیں۔مولانا مودودی کی تحریریں برصغیر میں بہت مقبول رہی ہیں اور ہیں۔کسی زمانے میں عرب نوجوانوں اور اصحاب فکر میں وہ کافی مقبول تھیں لیکن اب جو مقبولیت اور کثرتِ اشاعت مولانا مرحوم کی کتابوں کو حاصل ہے وہ مولانا کی کتابوں کو کبھی حاصل نہیں ہوئی بات یہ بھی ہے کہ مولانا مودودی کی تحریریں صرف دماغ کو اپیل کرتی ہیں جبکہ مولانا مرحوم کی تحریریں دل و دماغ دونوں کو اپیل کرتی ہیں۔اقبالؒ

کے شعروں کی طرح دلوں کو گرماتی ہیں ان میں ایمان کی حرارت پیدا کرتی اور ان کو متحرک کرتی ہیں۔

عملی سرگرمیاں:

نصف صدی تک مولانا کے قلم سے تصنیفات کا ایک سیل رواں جاری رہا ہے۔ بیک وقت اردو میں بھی اور عربی میں بھی لیکن اس کے ساتھ ہی مولانا مرحوم ایک طرف اپنی مادر علمی ندوہ کی ترقی میں کوشاں رہے جس نے ان کے عہد میں وہ ترقی کی ہے جس کا شبلی اور سید سلیمان ندوی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا ۱۹۵۵ء تک اس میں صرف ایک منزلہ ہوسٹل دارالاقامہ شبلی تھا اور ایک درسگاہ کی عمارت جو ہر چند کہ شاندار تھی لیکن اسی میں چھوٹے بچوں کا ہوسٹل اور لائبریری بھی تھی۔ میں نے اپنے زمانے ۴۹-۱۹۴۸ء میں یہی دیکھا تھا۔ اب ۱۹۹۶ء میں جا کر دیکھا تو دنیا ہی دوسری ہے۔ چار ملٹی اسٹوری ہوسٹل' لائبریری کی شاندار چار منزلہ عمارت لفٹ کے ساتھ' مجلس تحقیقات علمی کی علیحدہ عمارت اور کانفرنس ہال' ندوہ سے نکلنے والے مختلف عربی و اردو رسائل کے علیحدہ دفاتر' کمپاؤنڈ کے اندر ہی پوسٹ آفس' اسٹیٹ بینک کی شاخ' ایڈمنسٹریشن کے علیحدہ دفاتر وغیرہ غرض ایک نئی دنیا' یہ سب کچھ مولانا کی نظامت (سیکرٹری شپ) کے عہد میں ہوا۔ درحقیقت ندوہ کے قیام اور پھر اس کے انتظام اور ترقی میں اس خاندان کا بڑا حصہ رہا ہے۔ مولانا مرحوم کے والد ندوہ کے ناظم رہے۔ اپنی وفات یعنی ۱۹۲۳ء تک پھر ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اپنی وفات ۱۹۶۳ء تک ناظم رہے اور اس کے بعد مولانا علی میاں مرحوم۔ یہ عہدہ بالکل ایسا تھا جیسا کہ علی گڑھ کالج اور پھر یونیورسٹی میں سیکرٹری کا عہدہ رہا ہے۔

اپنے شدید دعوتی انہماک' مسلسل اندرون ملک اور بیرون ملک اسفار اور پیہم تصنیفی مشغولیت کے ساتھ دارالعلوم ندوہ پر یہ توجہ اور پھر اس کی یہ عظیم الشان غیر معمولی ترقی' اس کو مولانا مرحوم کا ایک کراماتی کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ مولانا مرحوم کے عہد میں ندوہ

کے ساتھ ملحق لیکن فاصلہ پر علیحدہ دینی وعربی درسگاہ طالبات کے لیے بھی قائم کی گئی ہے جو پوری کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔اس کے علاوہ ہندوستان کے طول وعرض میں بلکہ نیپال و بنگلہ دیش میں ندوہ کا نصاب پڑھانے والی دینی درسگاہیں قائم ہوگئی ہیں جن میں تعلیمی سرٹیفکیٹس ندوہ سے صادر ہوتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کیمبرج کے O, Level اور A, Level کے امتحانات ہندو پاکستان میں ہوتے ہیں۔

پھر اس تعلیمی ترقی کے ساتھ ایک تحقیق وتصنیفی ادارہ یعنی مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام کے نام سے ۱۹۵۹ء میں قائم کیا۔انگریزی میں اس کا نام Academy of Islamic Research and Publication رکھا گیا اور اس سے عربی' اردو' انگریزی اور ہندی میں دوسو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن کی مانگ ساری دنیا میں ہے۔

مولانا مرحوم کی توجہ کا مرکز صرف ندوہ اور ہندوستان وسعودی عرب کی جامعات ہی نہیں تھیں بلکہ وہ مغربی طرز پر قائم یونیورسٹیوں اور خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے تھے جیسے ندوہ سے۔یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۴ء میں جب علی گڑھ یونیورسٹی میں حبیب الرحمٰن شروانی ہوسٹل قائم کیا گیا تو اس موقعہ پر افتتاحی جلسہ میں مولانا مرحوم کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا بلکہ ان کے لیے ایک اعزازی جلسہ کیا گیا اس جلسہ میں جو خطاب مولانا نے کیا اس میں سرسید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے علی گڑھ کے طلبہ کو بڑے مفید مشورے دیے۔

اسی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی بھی مولانا کی دعوت اسلامی فکر وعزیمت کی جولان گاہ رہی' پروفیسر خلیق نظامی مرحوم اور ان کے فرزند ڈاکٹر فرحان نظامی نے جب یونیورسٹی میں ایک سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تو خلیق صاحب مرحوم کی نظر اس کے افتتاح اور صدارت کے لیے مولانا مرحوم پر پڑی۔مولانا مرحوم ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ تشریف لے گئے۔ صدارتی خطاب پیش کیا' آپ کی قیادت میں وہاں یہ سینٹر قائم ہوا جس کے آپ تاحیات

چیئرمین رہے اور ہر دو سال بعد اپنے ضعف و بیماری کے باوجود وہاں تنظیمی اجلاس میں شرکت کرتے رہے۔

امریکہ کا پہلا سفر انہوں نے ۱۹۷۷ء میں آنکھ کا آپریشن کے لیے کیا تھا لیکن دو ماہ وہاں قیام کے دوران آپ نے دسیوں جلسوں اور مختلف شہروں میں مسلمانوں اور امریکنوں کو خطاب کیا پھر دوسرا سفر ۱۹۹۴ء میں کیا جب آپ وہیل چیئر پر رہتے تھے۔ Gout کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا۔ یہ سفر شکاگو میں ایک جلسہ میں خطاب کرنے کے لیے وہاں کی دعوت پر تھا۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کو موت و حیات کے جو مراحل پیش آتے رہے اور جن چیلنجوں کا ان کو وقتاً فوقتاً سامنا کرنا پڑا مولانا مرحوم اس میں پیش پیش تھے۔ وہ صرف گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر لکھنے والے ایک مصنف نہ تھے۔ انہوں نے وہاں کے سربرآوردہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مختلف برسوں میں متعدد تنظیمیں قائم کیں، جیسے مسلم مجلس مشاورت دینی تعلیمی کانفرنس، مسلم پرسنل لاء بورڈ وغیرہ وہ ان تمام تنظیموں کی صدارت کرتے رہے۔ انہوں نے فساد زدہ خطرناک علاقوں کے دورے بھی کیے اور صوبائی و مرکزی حکومتوں کو مسلمانوں پر زیادتی کے سلسلہ میں متنبہ بھی کیا۔ انہوں نے فساد زدہ خطرناک علاقوں کے دورے بھی کیے اور صوبائی و مرکزی حکومتوں کو مسلمانوں پر زیادتی کے سلسلہ میں متنبہ بھی کیا۔ مولانا مرحوم کا ایک کارنامہ مسلم پرسنل لاء کو محفوظ کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، وی، پی سنگھ وغیرہ سے ملاقاتیں کیں ان کو خطوط لکھے، وفد لے کر ان سے ملتے رہے۔ اسی ضمن میں ان کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے راجیو گاندھی پر اپنی خدا پرستی اور خلوص و سچائی کا ایسا اثر ڈالا کہ ہائی کورٹ یا فیڈرل کوٹ کے فیصلہ کے خلاف راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ کا ایک خاص اجلاس بلا کر ایک ایکٹ پاس کرایا جس کی رو سے مسلمانوں کے پرسنل لاء میں حکومت و عدالت کو داخل کرنے کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔

اور پھر آخری زمانہ یعنی ۱۹۹۸ء میں جب ہندوستانی مرکزی حکومت نے سرکاری

اسکولوں میں بندے ماترم صبح کو گانا اور سرسوتی دیوی کی تصویر کے آگے جھکنے کو ضروری قرار پایا اور مسلمانوں کا احتجاج کوئی کام نہ کر سکا تو مولانا مرحوم نے اپنے T.V کے انٹرویو میں علی الاعلان یہ کہا کہ اگر حکومت نے اپنا یہ حکم واپس نہ لیا تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹالیں۔ مسلمان ایک خدائے واحد کے پرستار ہیں وہ کسی دیوی' دیوتا کے آگے سر نہیں جھکا سکتے۔ اس مجاہدانہ بیان پر مولانا مرحوم کے پتلے بنا کر ہندوؤں نے جلائے لیکن مرکزی حکومت کو بالآخر جھکنا پڑا اور اس نے اپنا حکم واپس لیا اور مسلمانوں کے لیے بندے ماترم گانا اور سرسوتی کی پوجا اسکولوں میں کرنا ضروری نہ رہا لیکن ہندو متعصبوں نے اس کے بعد مولانا کی قیام گاہ تکیۂ رائے بریلی پر دھاوا بولا' خوش قسمتی سے مولانا اس رات وہاں نہیں لکھنو میں تھے۔ بعد میں صوبائی حکومت نے اس پر معذرت پیش کی۔

اس سب کے پیش نظر مولانا کی وفات سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا سہارا اٹھ گیا ہے اور وہ سب اپنے آپ کو یقیناً یتیم محسوس کر رہے ہوں گے۔

اسی طرح مولانا عرب ممالک میں اسلام پرست عربوں کا بڑا سہارا تھے کیونکہ وہ عرب قومیت کے خلاف جمال عبدالناصر کے زمانے سے ایک ننگی تلوار تھے۔ انہوں نے اپنی بے شمار عربی تحریروں اور تقریروں میں اس ''ابوجہلیت'' کے خلاف مردانہ وار آواز اٹھائی جبکہ بہت سے عرب علماء اس رو میں بہہ گئے تھے۔ مولانا پوری استقامت اور جواں مردی کے ساتھ امت مسلمہ اور اس کی وحدت کے تصور پر قائم رہے۔ اسی طرح ان کی تحریروں میں لادینیت اور اشتراکیت پر زبردست کاٹ ہے۔

سعودی عرب اور خلیجی امارات وحکومت کے اسلام پرست عناصر کے لیے بھی وہ ایک بڑا سہارا تھے کیونکہ وہ بار بار ان ملکوں میں جانے کے باوجود ان حکمرانوں کی دولت سے مستغنی تھے اور ان کی عیش وعشرت کی زندگی اور ان کی امریکہ ومغرب پرستی پر بے لاگ اور تعمیری تنقید کرتے تھے۔ جو وہاں کے لوگ خود نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا مرحوم کو جو مقبولیت ومحبوبیت عرب

ملک میں حاصل تھی وہ کسی طرح اس سے کم نہیں تھی جو ان کو ہندوستان میں حاصل تھی۔ بلکہ عرب تو ان کو برکۃ العصر (برکت زمانہ) کہتے تھے۔

اسی طرح مولانا مرحوم ترکی میں انتہائی محبوب و مقبول تھے اور وہ ۱۹۸۷ء سے برابر ترکی ہر دو تین سال میں جاتے تھے جہاں ان کی قائم کردہ اسلامی ادبی تنظیم رابطہء ادب کا پہلا اجلاس ہوا اور بعد میں بھی متعدد اجلاس ہوئے۔ ترکی میں مولانا مرحوم کے اعزاز میں ایک یادگار سیمینار ۱۹۹۶ء میں منعقد ہوا جس میں مصر، سعودی عرب، قطر، اردن، دمشق، مراکش اور ترکی کے ممتاز دانشوروں اور یونیورسٹی پروفیسروں نے مولانا مرحوم کے افکار اور شخصی اوصاف پر مقالات پڑھے اور وہاں کے T.V نے یہ پروگرام نشر کیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترکی زبان میں مولانا مرحوم کی انتیس کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا نے خود اپنی کتاب کاروانِ زندگی میں فرمایا ہے کہ ''غیر عربی اور غیر اردو ملک میں ہماری عربی تصنیفات کے ترجمے اتنے شائع اور مقبول نہ ہوئے جتنے ترکی زبان میں ہوئے۔ (۶)

مولانا کی شخصیت:

مولانا نے بڑی دلنواز شخصیت پائی تھی۔ وہ انتہائی متواضع، نرم خو، خوش گفتار، سنجیدہ و متین، بلند حوصلہ، سادہ مزاج انسان تھے لیکن ان کی تواضع گردن جھکائے رکھنے والے تصنع پسند صوفیوں کی سی نہ تھی اور نہ ان کی سنجیدگی و متانت میں وہ خود پسندی اور کرختگی تھی جو بعض اہل علم میں پائی جاتی ہے۔ ہر وہ شخص جس کو مولانا مرحوم کی شاہانِ وقت اور مختلف سربراہانِ مملکت سے ملاقاتوں کا حال معلوم ہے وہ مولانا کی عزتِ نفس، خودداری اور عالی حوصلگی کی شہادت دے گا۔ ایسے بڑے لوگوں کے سامنے مولانا مرحوم نے کبھی اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھا وہ اپنے دینی بزرگوں، اپنے رفقاء بلکہ اپنے طلبہ کے ساتھ تواضع کے سلوک کرتے تھے۔ لیکن دنیاوی جاہ و جلال رکھنے والوں کے سامنے گردن نیچی نہیں کرتے تھے۔ مولانا مرحوم نے ۱۹۵۱ء میں اپنے شام و اردن کے سفر سے واپسی پر مدینہ منورہ میں اس خاکسار راقم اور دوسرے اپنے شاگردوں

کو اردن کے شاہ عبداللہ مرحوم سے اپنی ملاقات کا ذکر سنایا کہ جب شاہ ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے تو مولانا نے ان کے السلام علیکم کے بعد چوتھی صدی ہجری کے مشہور بغدادی شاعر الشریف الرضی کے وہ مشہور شعر پڑھے جس میں اس نے عباسی خلیفہ کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''جب فخر کی بات ہوگی تو یہ یاد رہے کہ ہم دونوں عالی نسبی میں شریک ہیں فرق اتنا ہے کہ آپ کو خلافت ملی ہوئی ہے اور میں اس سے محروم ہوں۔''

اپنے بزرگ اور شفیق استاد کے اس قصہ سے متاثر ہو کر راقم الحروف نے بھی ۱۹۹۱ء اسلامی تمدن کی کانفرنس کے موقعہ پر جب شاہ عبداللہ کے پوتے ملک حسین سے کھڑے کھڑے تمام مندوبین کے ساتھ ملاقات کی تھی تو عربی میں کہا تھا کہ جلالۃ الملک (یور میجسٹی) اجازت دیں تو عرض کروں کہ ہم دونوں چچازاد بھائی ہیں لیکن آپ کو فضیلت حاصل ہے کہ آپ بڑے بھائی سید ناحسن کی اولاد میں سے ہیں' تو شاہ حسین نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا اھلاً و سھلاً ھذا بلدک (یہ تمہارا اپنا ہی ملک ہے)۔

سعودی عرب کے مختلف بادشاہوں سے مولانا مرحوم کی ملاقاتیں اور مراسلت رہی۔ مولانا برابر ان کو مخلصانہ اور دردمندانہ نصیحتیں کرتے رہے۔ بلکہ شاہ فیصل کو ایک بار جو حکمت آمیز نصیحت کی تھی اس پر تو شاہ کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ اس قصہ کا ذکر مولانا نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں نہیں کیا جیسے تواضعاً اور بہت سے اپنی ذات سے متعلق واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن خورشید ندیم صاحب نے ۱۲ جنوری ۲۰۰۰ء کے جنگ میں اپنے کالم ''ایک عظیم روایت کا خاتمہ'' میں اس واقعہ کا ذکر کر دیا ہے۔ خاکسار راقم کو بھی یہ واقعہ پہلے سے معلوم تھا۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کی مولانا سے عقیدت کو میں نے خود ۱۹۸۶ء میں اسٹیٹ گیسٹ

ہاؤس کراچی میں دیکھا۔

اس خاکسار راقم کے نزدیک مولانا مرحوم کی شخصیت وصفات کی تصویر بہت پہلے ان ہی کے محبوب شاعر اقبال نے اپنی بصیرت سے ''مسجد قرطبہ'' نامی مشہور نظم کے مندرجہ ذیل اشعار میں کھینچ دی تھی۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات	ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل	اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو	رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں	اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

ان اشعار کا ایک ایک لفظ مولانا مرحوم کی شخصیت پر صادق آتا ہے۔ مولانا مرحوم کے علم کو تو سب لوگ جانتے ہیں لیکن ان کی للّٰہیت کو ان کے معاصر بزرگ مولانا الیاسؒ، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، خود ان کے شفیق استاد تفسیر اور ان کے پہلے مرشد مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ اور ان سے قریب ان کے شاگرد اور خدام ہی جانتے ہیں اور اسی للّٰہیت کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو خلق خدا میں محبوب بنا دیا تھا۔ صحیح حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میں اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہوں جاؤ زمین پر اعلان کر دو کہ سب اس سے محبت کریں۔

مولانا مرحوم نے نومبر ۱۹۹۰ء میں جب وہ اپنی رابطہ ادب اسلامی کی ایک کانفرنس میں لاہور آئے ہوئے تھے اس ناچیز راقم سے اپنا امریکہ کا ایک عجیب واقعہ سنایا۔ بات آنکھ کے آپریشن کی تھی جس کے لیے میں بہت دنوں سے امریکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ فلاڈلفیا میں جس عیسائی سرجن سے انہوں نے اپنی آنکھ کا آپریشن کرایا جس کی بینائی بارہ سال سے جا چکی تھی اور جس کے ہندوستان میں دو آپریشن ناکام ہو چکے تھے جس امریکن ڈاکٹر نے مولانا کی اس آنکھ کا آپریشان کیا اور کامیاب۔ اس نے مولانا مرحوم سے کوئی فیس

چارج نہیں کی یہ کہہ کر Your are a Saint اور میں Saints سے فیس نہیں لیتا ہوں۔ یہی نہیں مولانا نے بتایا کہ وہ ہسپتال میں ہمارے لیے اپنے گھر سے کھانا بھی منگا کر دیتا تھا۔ سچ بات ہے کہ اللہ اولیاء کے لیے اپنی مخلوق کو مسخر کر دیتا ہے۔

مولانا کی مخلوق سے بے نیازی اور اصحاب جاہ وثروت سے استغناء کے تو بیسیوں قصے ہیں نہ انہوں نے مشترکہ فیصل ایوارڈ کی ایک لاکھ ریال کی رقم میں سے اپنے پاس ایک پیسہ رکھا اور نہ ۹۹ء میں عرب امارات کے ایوارڈ سے ملنے والے ایک ملین درہم (ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے تقریباً) میں سے اپنے پاس کچھ رکھا بلکہ سب رقم انہی محفلوں میں مختلف تنظیموں اور اداروں کو دینے کا اعلان کر دیا۔ مولانا دمشق یونیورسٹی میں ۱۹۵۶ء اور مدینہ اسلامی یونیورسٹی میں ۱۹۶۳ء میں وزیٹنگ پروفیسر رہے کبھی ان دونوں ملکوں میں ایک پیسہ جائز معاوضہ کا نہیں لیا۔ ندوہ سے جہاں انہوں نے برسوں پڑھایا سن ۱۹۴۵ء سے کوئی تنخواہ لینا بند کر دی تھی۔ مولانا مرحوم کو اپنی کتابوں بلکہ صرف بعض کتابوں کی رائلٹی سے جو ملتا تھا وہی رقم ان کے لیے کافی ہوتی تھی یہ بھی اگر وہ ہندو پاکستان اور عرب ممالک سے پوری طرح لیتے تو لاکھوں روپے سالانہ بنتے لیکن بیشتر ناشر تو مولانا کو کچھ بھی نہیں دیتے تھے اور بہت سی ان کی کتابیں چوری سے چھاپتے تھے لیکن مولانا مرحوم کا شعار تو یہ تھا۔

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی ومرگ ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر وسیم

اقبال کا ایک دوسرا شعر اب معمولی تغیر کے ساتھ مولانا کے استغناء اور فیض رسانی پر صادق آتا ہے۔

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے تھے انداز خسروانہ

مولانا مرحوم کی ''درویشی'' اور خسروانہ انداز کا ذکر تو کسی قدر سطور بالا میں ہو گیا تھا لیکن جہاں تک خیر و ہدایت اور فضل وعلم کے چراغ جلانے کی بات ہے تو یہ چراغ ہندوستان کے

کونے کونے میں جل رہے ہیں بیسیوں درسگاہیں اور انجمنیں ہیں جو مولانا کی فکر دین کے درد، اسلام پر استقامت، خودداری وخودنگری کو عام کر رہی ہیں یہ چراغ مصر میں بھی جل رہا ہے۔ جہاں مصر کے ایک شہر منصورہ میں چند سال قبل ایک مصری عالم نے ایک اسلامک انسٹیٹیوٹ قائم کیا ہے جہاں مولانا مرحوم کی عربی، اسلامی، ادب اور تاریخ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ چراغ آکسفورڈ میں بھی جل رہا ہے۔ ۱۹۸۳ء سے جس کا سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز مولانا مرحوم کی صدارت ہی میں اور ان کی راہنمائی میں اسلامی تحقیق وفکر اسلامی کی اشاعت کا کام انجام دیتا رہا اور امید ہے کہ یہ محکم ادارہ آئندہ بھی یہ خدمات انجام دیتا رہے گا اگر یہ کہا جائے کہ

یک چراغے است دریں خانہ کہ از پرتو آں　　　ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

تو ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ مولانا مرحوم کے جلائے ہوئے اسلامی فکر وروحانیت کے چراغ ملک ملک جل رہے ہیں۔

مولانا حرکت وعمل کا ایک شعلہ تھے اگر ان کے اندرون ملک اور بیرون ملک ساٹھ پینسٹھ سالہ مسلسل سفروں اور تقاریر کی کہانی مرتب کی جائے تو اس ہی سے ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے گی۔ اس اعلیٰ علمی مقام اور عبادت وریاضت اور انابت الی اللہ کے ساتھ مولانا مرحوم میں بذلہ سنجی بھی تھی۔ ایک مرتبہ ایک صحبت میں فرمایا کہ امام شافعی نے لکھا ہے کہ نماز میں بائیں طرف کوئی ثقیل الدم (بد مذاق و بے ذوق) آدمی ہو تو صرف دائیں طرف سلام کہنا ہی کافی ہے۔ ایک مرتبہ ندوہ میں اپنے ایک عزیز شاگرد سے جو وہاں کی یونین میں صرف کرتے پائجامے میں تقریر کرنے جا رہے تھے فرمایا کیا بغیر شیروانی کے بھی تقریر کی جا سکتی ہے۔ پھر وہ گھر سے جلدی شیروانی پہن کر گئے۔

مولانا کا لباس لکھنؤ کے عام شرفاء کا لباس تھا۔ شیروانی اور اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی یا رام پور کی مخمل کی ٹوپی حجاز مقدس جانے کے بعد سے مولانا ٹوپی پر ایک سفید حجازی رومال بھی

اوڑھنے لگے تھے۔ پاؤں میں ہاف شو اور موزہ۔ کریمانہ اخلاق اور وسیع المشربی کے سبب مغربی تعلیم یافتہ حلقوں میں بھی اتنے ہی مقبول ومحبوب تھے جتنے دینی حلقوں میں۔

آج سے ۵۴ سال قبل جو بات مولانا مرحوم نے مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی وفات پر کہی تھی وہی میری زبان سے اپنے مولانا مرحوم کی وفات پر نکلی کہ ہم تو بے چین وغمگین ہیں لیکن مرحوم کو برسوں کی مسلسل جدوجہد اور انتھک دعوتی کاموں اور اسفار کے بعد اب قبر میں اللہ نے آرام مہیا کیا مولانا مرحوم کے الفاظ مولانا محمد الیاس کی وفات پر یہ تھے ''عمر بھر کا تھکا مسافر کہ شاید کبھی اطمینان کی نیند سویا ہو منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سویا۔''

یہ خاکسار راقم اس جملہ پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ مولانا محمد الیاسؒ تو عمر بھر کے اتنے تھکے مسافر نہ تھے جتنے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کیونکہ اول الذکر پر اپنی تبلیغی سرگرمی کے علاوہ کوئی بوجھ نہ تھا لیکن مولانا مرحوم پر تصنیف وتالیف کا مسلسل بوجھ تھا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک سینکڑوں سفر تھے' کانفرنسوں کا بوجھ تھا' مختلف تعلیمی وتحقیقی اداروں اور دینی سیاسی تنظیموں کا بوجھ تھا' سینکڑوں جگہ تقریر کرنے کا بوجھ تھا۔ جتنا مولانا علی میاں تھکے تھے شاید ہی برصغیر میں کوئی عالم اور اہل اللہ اتنا تھکا ہو۔ حتیٰ کہ آٹھ نو ماہ قبل فالج کے حملہ کے بعد اور تین چار ماہ کے بعد افاقہ ہونے کی صورت میں مولانا مرحوم نے پھر فکری کاوش (Activity) شروع کر دی تھی۔ مضمون املاء کرانا شروع کر دیے تھے ان کا آخری اہم کام مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس کے لیے صدارتی خطبہ تھا جو مولانا نے املاء کرا کے احمد آباد بھجوایا کہ سفر ناممکن تھا۔ فردوس بریں کے اس پاک باز مسافر کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بہت نوازا' آپ پر مختلف ممالک میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے چار مقالے! ایم فل اور پی ایچ ڈی کے چار مقالے لکھے گئے۔ زندگی کے آخری برسوں میں متعدد کتابیں اردو اور عربی میں آپ کی زندگی پر لکھی گئیں جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مشاہیر واکابر کی نظر میں۔ تصنیف مولانا

ممشاد علی قاسمی دہلی ۱۹۹۸ء۔

۲۔ سماحۃ الداعیۃ المجاہد ابوالحسن علی الحسنی الندوی ومولفاتہ العربیۃ
(عربی زبان میں مولانا مرحوم کی تصنیف محمد طارق زبیر ندوی۔ انڈیا ۱۹۹۸ء میں عربی تصانیف کی فہرست وتعارف)

۳۔ ابوالحسن علی الحسنی ندوی الندوی الامام المفکر والداعیۃ الادیب (عربی)
تصنیف عبدالماجد الغوری دار ابن کثیر دمشق (۱۹۹۸ء)

۴۔ الاستاد ابوالحسن کاتبا ومفکرا (عربی)
(از نذر الحفیظ الندوی۔ انڈیا (یہ مولانا کی تصنیفات کی ببلیوگرافی ہے)

۵۔ میر کارواں (اردو) از مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی دہلی نومبر ۱۹۹۹ء

یہ سب سے آخری کتاب ہے جو مولانا مرحوم کی وفات سے ڈیڑھ دو ماہ قبل چھپی اور مولانا کے ایک ایسے شاگرد رفیق کے قلم سے ہے جو مولانا مرحوم سے تقریباً ساٹھ سال وابستہ رہے۔ یہ سب سے عمدہ سوانح حیات اور بیانِ فکر ہے۔

آخر میں سب سے اہم مولانا مرحوم کی خودنوشت کاروانِ زندگی ہے (سات جلدیں مجلس نشریات اسلام ناظم آباد نمبر ا کراچی) جو اردو زبان کے خودنوشت سوانحی ادب میں ایک سنگ میل ہے۔

مولانا مرحوم کے لیے ہم سب کی دعائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور کرے' ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے فیض علمی وروحانی کو جاری وساری رکھے آمین۔

حواشی

۱- اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ اکابر و مشاہیر امت کی نظر میں (مطبوعہ دہلی ۱۹۹۸ء) ص ۲۰۴، ۲۱۷

۲- کاروانِ زندگی از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جلد اول ص ۳۵۶ (مجلس نشریات اسلام کراچی)

۳- شاہ فیصل کے عہد میں حرم شریف کی توسیع و تعمیر سے قبل حرم شریف کے صحن میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کنکریاں بچھی ہوتی تھیں اور ان پر دری کی صفیں اور بیچ بیچ میں سیاہ پتھروں کی راہداریاں یا روشیں تھیں۔ ان کنکریوں کو عربی زبان میں حصباء کہا جاتا ہے۔ حجاز کی لوکل یا مقامی عربی میں ان کو حصوہ (ح پر زبر اور ص پر جزم) کہا جاتا ہے۔ اس نرم نیچرل فرش پر رات کو گرمی میں لوگ سو بھی جاتے تھے کبوترانِ حرم کو دانہ بھی انہیں پر ڈالا جاتا تھا اور ہر دو تین ماہ بعد ان کو بدل کر نئی کنکریاں بچھائی جاتی تھیں۔

۴- اس وقت مصلیٰ شافعی سے اذان دی جاتی تھی جہاں سے صرف چند گز کے فاصلے پر مطاف اور کعبۃ اللہ تھا اب توسیع حرم کے بعد یہ مذنہ کافی دور اندر کی سمت میں ہو گیا ہے۔

۵- ملاحظہ ہو راقم کا ''مقالہ سید عبداللہ شاہ غازی اور تاریخ'' (اس کی تصنیف ''تحقیقات و تاثرات'' میں، مطبوعہ لاہور ۲۰۰۰ء)

۶- کاروانِ زندگی حصہ ششم ص ۲۹۶

سرمایۂ ملت کے پاسبانؒ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بمطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء بروز جمعہ عین نماز جمعہ کے وقت، روزہ کی حالت میں اور سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے صدر نشین، رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی رکن، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے رکن، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے صدر، مجلس انتظامی و مجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سربراہ، عربی اکیڈمی دمشق کے رکن، مجلس شوریٰ مدینہ یونیورسٹی کے رکن، مجلس عاملہ موتمر عالمی اسلامی بیروت کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، رابطہ الادب الاسلامی العالمیہ کے صدر، مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا کے رکن، سابق پروفیسر امارات اور وزیٹنگ پروفیسر مدینہ یونیورسٹی، آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز، آکسفورڈ یونیورسٹی کے صدر، عربی اردو میں بیسیوں کتابوں کے مصنف، عربیت کے امام، عالم اسلام کی عظیم علمی و روحانی شخصیت اور عظیم مفکر و اسکالر، اقلیم علم کے تاجدار اور سرمایۂ ملت کے پاسبان حضرت اقدس مولانا ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ان اللہ اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی۔

راقم الحروف نے کئی سال قبل ''میرے حضرت بنوری کی چند حسین یادیں'' کے عنوان سے ماہنامہ ''اقراء ڈائجسٹ'' کے لیے لکھا تھا۔

''حق تعالیٰ شانہ کے جو بے پایاں انعامات واحسانات اس ناکارہ کے شامل حال ہیں ان میں سے ایک عظیم انعام یہ ہے کہ اپنے مقبول و محبوب بندوں کی محبت قلب میں ودیعت فرمائی اور ان سے ربط وتعلق نصیب فرمایا۔ فلہ الحمد للہ ولہ الشکر۔ ہمارے حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی نوراللہ مرقدہ یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے:

گرچہ از نیکا نیم لیکن بہ نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرینش رشتہ گلدستہ ام

چار بزرگوں کے ساتھ اس ناکارہ کو بچپن ہی سے عشق کی حد تک عقیدت ومحبت تھی۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ، حضرت امام التبلیغ مولانا محمد یوسف الدھلوی نوراللہ مرقدہ، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہ اور حضرت سلطان القلم مولانا مناظر احسن گیلانی نوراللہ مرقدہ۔'' (شخصیات وتاثرات ص ۱۳۲، ۱۳۳)

مگر ہوش سنبھالنے کے بعد ان اکابر کے علاوہ پانچویں بزرگ، جن کے کمالات، علوم و معارف، فضل واحسان، ورع وتقویٰ، دعوت وعزیمت، حق گوئی و بے باکی، ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لیے گھلنے اور پگھلنے سے میں زیادہ متاثر ہوا، جن کی خدمات پر بے حد رشک آیا اور جن سے غائبانہ عقیدت، محبت میں بدل گئی وہ حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ کی جامع الصفات اور ہمہ گیر شخصیت تھی۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی المعروف بہ علی میاں قدس سرہ کے کس کس گوشۂ حیات اور کمالات زندگی کو احاطۂ تحریر میں لایا جائے؟ اسے کس طرح شروع کیا جائے؟ اور کہاں سے

شروع کیا جائے؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ زبان وقلم اور الفاظ وحروف ساتھ نہیں دے رہے۔ حضرت مرحوم کی وفات کا سانحہ جہاں ہندو پاک کے مسلمانوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے وہاں عرب وعجم اور شرق وغرب اور دنیائے اسلام کے مسلمان' اس صدمہ سے دوچار ہیں، حضرت مولانا علی میاں کی وفات سے ایک طرف اگر ان کے پسماندگان اور متعلقین غم زدہ ہیں تو دوسری طرف ان کی وفات سے حجاز مقدس اور حرمین کے اکابر علماء اور ارباب اقتدار بھی اس صدمہ جانکاہ کو سہارنے کی ہمت نہیں پاتے، چنانچہ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل صدر شئون حرمین شریفین اور مسجد حرام کے خطیب وامام' اس سانحہ پر اپنے تعزیتی مکتوب میں لکھتے ہیں:

''محترم علماء کرام' گرامی قدر ذمہ داران ندوۃ العلماء اور ملت اسلامیہ ہند۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

شدید قلبی رنج اندوہ اور غم کے ساتھ عالم جلیل اور داعی عظیم حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کی وفات کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ اس عظیم صدمہ کو جھیلنے کی سکت آپ اور ہم سب کو عطا فرمائے اور آپ اور تمام پسماندگان کو بیش از بیش اجر سے نوازے اور اس خسارے کی تلافی فرمائے۔ ہم آپ سے تعزیت کرتے وقت خود بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔ بلکہ ساری امت اسلامیہ سے تعزیت کی جانی چاہیے۔ حضرت مولانا کا سانحہء وفات ایک زبردست حادثہ ہے اور شدید آزمائش ہے جس سے تمام مسلمانان عالم اس وقت دوچار ہیں۔ اس لیے کہ مولانا موحوم نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنی زبان وقلم اور جسم وجان کو وقف کر دیا تھا اور اس میدان میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں' آپ کو اور تمام برادران اسلام کو اس صدمہء جانکاہ کو سہارنے کی طاقت عطا کرے اور عالم اسلام کی اس محرومی کی

تلافی فرمائے۔

ہم اس موقع پر آپ کو یہ اطلاع دینا چاہیں گے کہ خادم الحرمین شریفین فہد بن عبدالعزیز فرماں روائے مملکت سعودی عرب نے حرم مکی و مدنی دونوں جگہ ۲۶ رمضان ۱۴۲۰ھ بروز دو شنبہ بعد نماز عشاء (یعنی ستائیسویں شب) حضرت مرحوم کے لیے غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرنے کا حکم جاری فرمایا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ علامہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور انہیں اپنے نیکوکار بندوں میں شامل فرمائے اور انہیں ابرار و اتقیاء شہداء و صالحین کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا بھائی

محمد بن عبداللہ السبیل

صدر امور حرمین شریفین، امام وخطیب مسجد حرام، مکہ مکرمہ"

(پندرہ روز تعمیر حیات لکھنو ۱۶ رمضان تا ۳ شوال ۱۴۲۰ھ)

حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ تکیہ کلاں رائے بریلی انڈیا میں مشہور علمی شخصیت حضرت مولانا عبدالحئی ندوی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر بریلی میں اپنے والد ماجد اور بڑے بھائی جناب حکیم عبدالعلی ندوی سے حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور دارالعلوم دیوبند سے تکمیل ہوئی۔ قرآن کریم کی تفسیر امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ سے پڑھی، حضرت لاہوریؒ سے ہی بیعت ہو کر مجاز بیعت قرار دیے گئے، بعد میں آپ نے قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا اور ان سے بھی خلافت واجازت کی خلعت سے سرفراز ہوئے۔ علوم عالیہ

وآلیہ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ آپ نے فن ادب عربی میں رسوخ حاصل کیا۔ برصغیر اور عالم اسلام کی ممتاز شخصیت جناب پروفیسر خلیل عرب سے آپ نے عربی پڑھی اور اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ دنیائے عرب آپ کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانتی تھی۔ آپ کی تصانیف برصغیر پاک و ہند سے زیادہ بلاد عرب میں محبوب مقبول تھیں۔ بقول ایک عرب دانشور کے کہ ''اگر اس دور میں جاہلی شعرا اور آئمہ لغت عربی ہوتے تو وہ آپ کو سجدہ کرتے۔''

آپ عوام وخواص اور عرب وعجم کے امام اور محبوب تھے۔ آپ کی خدمات جلیلہ کے عوض سعودی عرب کی جانب سے آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا، برونائی کے بادشاہ نے عالم اسلام کی عظیم شخصیت اور خدمات عالیہ کے عوض آپ کو اپنے ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ دیا، اسی طرح انہیں ابوظہبی حکومت کی طرف سے بھی سب سے بڑے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا مگر ایوارڈوں سے حاصل ہونے والی لاکھوں ڈالر کی رقم حضرت مرحوم نے مجاہدین افغانستان اور دینی مدارس کو عطیہ کر دی۔

لیکن جہاں تک حضرت مرحوم کی ذات' ان کی اولوالعزمی اور مرتبہ ومقام کا تعلق ہے وہ دنیا کے بڑے سے بڑے انعام اور ایوارڈ سے بالاتر تھی۔ جن دنوں سعودی حکومت نے حضرت اقدس کو ان کی خدمات کے اعتراف میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا تھا' انہیں دنوں راقم الحروف نے ماہنامہ بینات میں حضرت کی شخصیت سے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا تھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔

> ''سعودی حکومت کی جانب سے امسال ''شاہ فیصل ایوارڈ'' عالم اسلام کے مایہ ناز مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کو دیا گیا۔ سعودی حکومت کی طرف سے معارف پروری کا یہ اظہار لائق تحسین ہے اور اسلامی حکومتوں کے لیے لائق تقلید بھی۔ جہاں تک مولانا کی ذات گرامی کا تعلق ہے ان کی شخصیت دنیا کے کسی بڑے سے

بڑے انعام سے بالاتر ہے۔ وہ اس قافلہ کے نمائندہ ہیں جو ''ان اجری الاعلیٰ اللہ'' کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے اور جس کے نزدیک پوری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی۔ اس لیے ہمارے نزدیک ''شاہ فیصل ایوارڈ'' سے حضرت کی عزت و وقار میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ یہ اس ایوارڈ کے لیے باعث صد نازش ہے کہ مولانا نے اسے قبول فرمالیا۔

حق تعالیٰ شانہ نے حضرت مولانا کو محض اپنی عنایت و موہبت سے، جن فطری خصائص و کمالات، جن ملکات حمیدہ اور جذبات صالحہ، جس سوز و گداز اور درد دل، جس قلب صافی اور نفس مطمئنہ سے نوازا ہے اور پھر ان کے سینہ بے کینہ میں اسلام اور عالم اسلام کی سربلندی اور اصلاح امت کے لیے گھلنے اور پگھلنے کی جو دولت ودیعت فرمائی ہے اور پھر ان کی زبان و قلم سے اسلام کی پیغام رسانی کا جو کام لیا ہے اس کا اصل صلہ اور بے حد و بے پایاں صلہ۔ ان کو خدا تعالیٰ کے سوا کون دے سکتا ہے؟ اور وہ آخرت کے سوا کہاں مل سکتا ہے؟ تاہم ''ثم یوضع له القبول فی الارض'' کے مطابق دنیا میں جو محبوبیت و مقبولیت انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے وہ اسی موہبت کا ایک ثمرہ ہے۔ حضرت مولانا نے مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں مسلسل اسلام کی دعوت کا صور پھونکا ہے اور وہ پوری انسانیت کو اسلام کے خوان یغما پر جمع ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی امریکہ و لندن پہنچ کر ''مغرب سے صاف صاف باتیں'' کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی قاہرہ میں ''اسمعی یا مصر'' کی اذان دیتے ہیں اور کبھی ''اسمعوها منی صریحه ایها العرب'' کے ذریعے معدن اسلام (عرب) کے نمائندوں کے مقتداؤں کو بیدار کرتے ہیں۔ کبھی انہیں ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' کی کہانی سناتے ہیں۔ (جس کا ایک رخ وجد آفرین ہے تو دوسرا خون افشاں) کبھی ان کے سامنے ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کھول کر رکھتے ہیں۔ کبھی انہیں ''اسلامیت و مغربیت کی کشمکش'' کے ہولناک

پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہیں۔ کبھی انہیں آج کے نظریاتی قافلوں سے ہٹ کر ''کاروان مدینہ'' میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ الغرض مولانا کی دعوت شرق وغرب، عرب وعجم اور افریقہ وایشیا کی حد بندیوں سے بالاتر ہے، وہ پوری انسانیت کو، سسکتی بلکتی انسانیت کو، مادی زخموں سے چور چور انسانیت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستگی کی دعوت دیتے ہیں۔ سعودی حکومت اور دیگر اسلامی ممالک کی طرف سے مولانا موصوف کی دینی خدمات کی قدردانی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اس دعوت کو اپنائیں جو مولانا مدظلہ کی طرف سے مسلسل پیش کی جاری ہے اور جس کے لیے ان کی پوری زندگی وقف ہے۔''

(شخصیات وتاثرات ص ۴۱۱، ۴۱۲)

حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ کا اس ہیچ مداں کے ساتھ نہایت مشفقانہ تعلق تھا، وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ ان کی حیثیت سے بڑھ کر اعزاز واکرام کا معاملہ فرماتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی حیات پر آپ کی عربی تصنیف ''المرتضیٰ'' شائع ہوئی تو اپنے دستخطوں کے ساتھ جناب مولانا قاری سید رشید الحسن صاحب زید مجدہم کی وساطت سے ناکارہ کو بھجوائی اور فرمائش کہ اس پر بینات میں تبصرہ کیا جائے۔ راقم الحروف نے اس کا اول سے آخر تک مطالعہ کیا اور حضرت اقدس کو عریضہ لکھا کہ ''اس کی تعریف میں کچھ کہنا ''مادح خورشید مداح خود است'' کا مصداق ہوگا، ماشاء اللہ کتاب میں بہت ہی اہم معلومات جمع ہوگئی ہیں اور نہایت الجھے ہوئے مضامین کو بہت ہی عمدہ اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش فرمانا آنجناب ہی کے لائق تھا۔''

اس کے علاوہ غالباً طالب علمانہ اشکالات بھی پیش کیے، اس پر حضرت مرحوم نے اس ناکارہ کی جس طرح حوصلہ افزائی فرمائی وہ میری سوچ وفکر سے کہیں زیادہ اونچی تھی، چنانچہ حضرت مرحوم نے اس خط کی رسید بھیجتے ہوئے لکھا:

رائے بریلی

فاضل گرمی ومحب سامی جناب مولانا یوسف صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ مورخہ ۲۱ جمادی الآخرۃ، مجھے ایک طویل سفر کی وجہ سے تاخیر سے ملا، پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی، یہ کتاب کی پہلی رسید ہی نہیں سند بھی ہے، میں آپ کی پسندیدگی کو قبولیت کی ایک علامت سمجھتا ہوں، دوسرا ایڈیشن پریس جا رہا ہے اس میں اہم تصحیحات اور بعض ترمیمات کر دی گئی ہیں۔ جن سے توازن و اعتدال میں اضافہ ہو گیا ہے، انشاء اللہ طباعت کے بعد کتاب ارسال خدمت کی جائے گی۔ بینات میں تعارف کا اشتیاق رہے گا۔ ڈاکٹر زاہد علی صاحب کی کتاب (''ہمارا اسماعیلی مذہب اور اس کا طریقہ کار'' ناقل) شائع کر کے آپ نے ایک اہم خدمت انجام دی ہے کتاب پہنچ گئی۔ میں نے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے پہلے حصے میں اس سے مدد لی تھی اور اس کے اقتباسات پیش کیے تھے۔ کارڈ لکھنے کی معافی چاہتا ہوں اس لیے کہ اس کے جلد پہنچنے کی امید ہوتی ہے۔ والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۲۲ فروری ۱۹۸۹ء

حضرت کی وفات سے امت ایک عظیم رہبر و رہنما اور مشفق و مربی سرپرست اور باخدا عارف ربانی سے محروم ہو گئی اور مجالس علم و عرفان اور طبقہ اہل علم یتیم ہو گئے ہیں۔

حضرت مرحوم کی ذات سے اللہ تعالیٰ نے وہ کام لیا جو پوری ایک جماعت کے لیے مشکل ہے، یہ ان کی مقبولیت عنداللہ اور موفق من اللہ ہونے کی علامت ہے کہ ان کے لمحات زندگی کو دین اور اشاعت دین کے لیے قبول فرما لیا گیا۔

حضرت مرحوم کی عمر اس وقت تقریباً ۸۵ برس تھی۔ دو سال قبل آپ پر فالج کا حملہ ہوا تھا

مگر صحت یاب ہو گئے تھے۔ ۲۲ رمضان المبارک کو روزہ رکھا، طبیعت ہشاش بشاش تھی، غسل فرمایا کپڑے تبدیل فرمائے سورہ کہف کی تلاوت کا معمول تھا۔ مگر اس دن سورۂ کہف سے پہلے سورۂ یٰسین شروع فرمادی۔ سورہ یٰسین کی گیارہویں آیت ''بشرہ بمغفرۃ واجر کریم'' پر پہنچے ہی تھے کہ دل کے درد کی شکایت ہوئی، طبی امداد دینے کی کوشش سے پہلے ہی وہ روزہ کی حالت میں، تلاوت کرتے کرتے عین جمعہ کے وقت اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے پسماندگان، متعلقین اور لاکھوں عقیدت مندوں کو سوگوار اور یتیم چھوڑ کر جوارِ رحمت الٰہیہ میں چلے گئے۔ فاناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے ساتھ رضا ورضوان کا معاملہ فرما کر ان کے درجات کو بلند فرمائے، ان کے پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت مولاناؒ کے مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

مردِ مومن کا آخری سفر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا معمول یہ تھا کہ تہجد سے قبل بیدار ہو جاتے، استنجا اور وضو سے فارغ ہو کر نوافل کی نیت باندھ لیتے۔ کبھی چار، کبھی چھ، کبھی آٹھ رکعت پڑھتے۔ اس رمضان میں نوافل کا اہتمام بہت بڑھ گیا تھا۔ سحری ختم ہونے سے دس منٹ قبل سحری کھاتے۔ اس کے بعد کبھی تو ہاتھ اٹھا کر اور کبھی بغیر ہاتھ اٹھائے دعا فرماتے۔ اذان کے بعد فجر کی سنت پھر فرض کے بعد منزل پڑھتے اور لیٹ جاتے۔ آخری عشرہ میں فجر بعد جو لوگ واپس ہوتے وہ مصافحہ کے لیے حاضر ہوتے۔ ان کو لیٹے لیٹے رخصت فرماتے اور دعائیہ کلمات کہتے۔ رمضان کے دنوں میں کوشش فرماتے کہ ساڑھے نو بجے اٹھ جائیں۔ استنجاء اور وضو سے فارغ ہو کر دو رکعت نفل پڑھتے پھر قرآن شریف کم از کم آدھا پارہ ورنہ عام طور پر ایک پارہ تلاوت فرماتے۔ اس کے بعد سورۃ یٰسین روزانہ گیارہ مرتبہ اور جمعرات کے دن تیرہ بار تلاوت فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت تک کے تمام مجاہدین و مصلحین اور اصحاب دعوت و عزیمت، ربانی و حقانی علماء اور اپنے اساتذہ اور محسنوں اور عزیز و اقارب اور عام مسلمانوں کو ایصال ثواب کرتے، اسفار میں جس شہر اور بستی سے گزرتے وہاں کے مدفون مسلمانوں کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام فرماتے۔

جان لیوا امراض سے سنبھالا لینے کے بعد اہل تعلق کا یہ تاثر تھا کہ یہ عارضی صحت ہے، کسی وقت بھی یہ دولت بے بہا ہم سے چھن سکتی ہے۔ خود حضرت والا بھی اس طرح کے جملے بڑے درد و کرب سے مختلف اوقات میں فرماتے تھے۔ اللھم لقاءک، کبھی فرماتے اب ہم بھی چلے،

خدایا عاقبت محمود کردی۔ کبھی فرماتے اے اللہ اب تو بلا لے، اس معذری کے ساتھ کب تک؟ ایک خادم سے مختلف وقتوں میں فرمایا تم پر کام کا بوجھ بہت ڈال دیتے ہیں، بس کچھ ہی دن تک ہے۔

شعبان کا آغاز ہوتے ہی یہ سوال خدام اور حضرت کے معالجین کے درمیان گردش کرنے لگا کہ رمضان کا مہینہ کہاں گزرے گا۔ ڈاکٹروں نے اصرار کیا کہ ندوہ میں گزرے، آخر میں حضرت والا کے انشراح اور مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔

حضرت نے فرمایا کہ رمضان سے قبل رائے بریلی جانا ہے۔ چنانچہ ۲۷ شعبان کو تکیہ تشریف لائے، ۲۸ کو قیام کر کے خلاف معمولی مولوی سید حسنی سے فرمایا کہ مجھے مسجد لے چلو، مسجد کے صحن میں جانماز بچھادی گئی، دو رکعت نماز ادا کی، پھر مسجد کے اندرونی حصے میں تشریف لے گئے وہاں بھی دو رکعت نماز ادا کی پھر فرمایا ندی کی طرف سے چلو چنانچہ جہاں نئے زینے بنے ہیں وہاں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ فرمایا ماشاءاللہ اس کے بعد فرمایا مسجد کی پشت پر لے چلو جہاں سید صاحب کے زمانے کا ایک پتھر رکھا ہوا ہے۔ تکان کے خیال سے یہ فرمائش نہیں پوری کی گئی۔ مسجد سے نکلتے وقت سامنے ہی شاہ علم اللہ کا روضہ ہے جہاں محبوب والدین اور بھائی بہن کے علاوہ بھی گنج ہائے گراں مایہ دفن ہیں۔ وہاں سے واپسی پر تکان کے باوجود گھر کے اندر تشریف لے گئے جہاں گھر کی تمام مستورات جمع تھیں۔ مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی بھی موجود تھے۔ پندرہ منٹ کے بعد گھر سے واپس بنگلہ پر تشریف لے آئے۔ بعد ظہر آرام کر کے اول وقت عصر کی نماز پڑھی پھر گھر تشریف لے جا کر ملاقات کی اور لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ پہلا روزہ شروع ہوا تو فرمایا کہ معلوم نہیں پورا رمضان ملتا ہے یا نہیں۔ اے اللہ! تو پورے رمضان کی برکتوں سے نواز دے۔ وطن میں آخری عشرہ گزارنے کے بارے میں حضرت والا نے اپنے معالجوں سے اجازت لے لی تھی۔ ڈاکٹر نظر عبدالمعبود خاں، ڈاکٹر سید قمر الدین اور ڈاکٹر کرنل شمسی اس مشورہ میں شریک تھے۔ ۲۰ رمضان ۲۹ دسمبر کو رائے

بریلی ایک بڑے قافلہ کے ساتھ روانگی ہوئی۔ یہاں معتکفین سے مسجد بھر گئی۔ فرمایا ''بانی کا اخلاص ہے'' آخری شب تراویح کے بعد ساڑھے نو بجے مجلس میں معمول کے مطابق تشریف فرما مختلف سوالات کے جوابات دیے۔ دمشق سے چھپ کر حضرت والا کی جو تصنیفات آئی تھیں ان کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے لکھوائی ہیں۔ ایک خادم نے جو باہر کے دورے سے حاضر ہوئے تھے حضرت کو جب یہ اطلاع دی کہ ایک صاحب خیر نے ستائیس ہزار ڈالر ترکی کے ایک ناشر اور مترجم کو دیے ہیں کہ وہ حضرت کی تمام تصنیفات شائع کر کے ترکوں میں مفت تقسیم کریں تو اس خبر پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا مجلس میں العاقبۃ للمتقین سے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ عاقبت مذموم بھی ہوتی ہے اور محمود بھی۔ آخر میں استفسار فرمایا کہ کیا کل جمعۃ الوداع ہے؟ وصال کے دن بھی مذکورہ بالا روزانہ کے تمام معمولات پورے فرمائے۔ ساڑھے نو بجے بیدار ہو کر استنجا کے لیے گئے۔ وضو کے بعد نوافل پڑھے پھر قرآن شریف کی تلاوت کی، سجدہ تلاوت بھی کیا۔ لکھنؤ میں قرآن مجید ختم کر چکے تھے۔ تیرھواں پارہ آخری دن پڑھا۔ بھائی صابر جو برسوں سے حضرت کا خط بناتے آئے تھے ان سے خط بنوایا۔ اس کے بعد نہانے کی تیاری کی، بھائی ذکاء اللہ خاں اندوری راوی ہیں۔ غسل خانہ جانے سے پہلے سوال کیا کہ کیا آج بائیس رمضان ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا نماز جمعہ پندرہ منٹ تاخیر سے ہو سکتی ہے۔ بھائی عبدالرزاق نے عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو تاخیر سے نماز ہوگی، ساڑھے گیارہ بجے غسل کے لیے تشریف لے گئے۔ پندرہ منٹ بعد غسل سے فارغ ہو کر آ گئے۔ کپڑے زیب تن کیے۔ شیروانی کے بٹن مولوی سید بلال حسنی نے لگائے۔ فرمایا کہ تم لوگ تیار ہو جاؤ، نماز میں پندرہ منٹ تاخیر کرا دو۔ فرمایا کہ اب ہم سورۂ کہف پڑھیں گے۔ (اس سورۃ کے پڑھنے کا معمول آٹھ سال کی عمر سے تھا) یہ فرما کر بستر پر بیٹھ گئے لیکن بجائے سورہ کہف پڑھنے کے سورہ یٰسین پڑھنے لگے، اندازہ ہے کہ دس بارہ آیتیں ہوئی ہوں گی کہ زبان رک گئی۔ جس طرح بیٹھے تھے اس سے تھوڑا سا پیچھے کی طرف جھک گئے، مولوی بلال حسنی نے سر کو اور خادم خاص بھائی

عبدالرزاق نے پاؤں کو اٹھا کر تخت پر لٹایا۔ ڈاکٹر سید قمرالدین اور ڈاکٹر عبدالمعبود خاں قریب ہی تھے، آکسیجن لگائی گئی۔ انجکشن جب رگوں میں نہیں لگ سکے تو کولہے میں لگائے گئے۔ ڈاکٹر قمرالدین صاحب نے ایک انجکشن دل پر لگایا ہاتھ سے قلب کی مالش کی اور منہ سے ہوا بھی بھرنے کی کوشش کی لیکن راہ حق کا یہ مسافر روانہ ہو چکا تھا اس وقت بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور محبین واہل تعلق کے قافلے دیوانہ وار رائے بریلی پہنچنا شروع ہو گئے۔ غسل دینے میں حسب ذیل حضرات شریک تھے۔ مولوی سعید بنوندوی (جنوبی افریق) جو رمضان گزارنے آئے تھے۔ حضرت کے مجاز بھی ہیں۔ خادم خاص بھائی عبدالرزاق، سید حسن عسکری طارق صاحب (مدینہ منورہ) مولوی سید بلال حسنی ندوی، حضرت کے کاتب خاص مولوی نثار الحق ندوی، مولوی نیاز احمد ندوی بھی شریک ہو گئے اور اس موقعہ پر مولانا محمد سید رابع حسنی ندوی، مولوی سید سلمان حسینی ندوی، مولوی عبداللہ حسنی ندوی موجود تھے اور بھائی عبدالمجید (خادم) عزیزان محمود حسنی، محمد معاذ کاندھلوی اور سید شارق سلمہم موجود رہ کر معاونت کر رہے تھے۔

بعد مغرب سات بجے سے پونے دس بجے تک آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم رہا جو بتدریج بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نماز جنازہ کا اعلان دس بجے کیا گیا تھا، چنانچہ ٹھیک پونے دس بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ دو منٹ کا راستہ پچیس منٹ میں طے ہوا۔ مسجد کے اندر منبر کے قریب جنازہ رکھا گیا۔ مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ساڑھے دس بجے جنازہ قبر میں اتارا گیا۔ قبر میں جن لوگوں نے جنازہ اتارا ان میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی، خادم خاص بھائی عبدالرزاق تھے۔ بھائی عبدالرزاق اور سید بلال حسنی لکڑی کے پٹرے لگا رہے تھے۔ محبوب منصور پوری پڑے دے رہے تھے۔ آخری پڑا لگانے سے پہلے کسی نے توجہ دلائی کہ کفن کا بند کھولا نہیں جا سکا۔ چنانچہ مولوی بلال حسنی نے قبر میں اتر کر بند کھول دیا پھر آخری پڑا بھی لگا دیا گیا۔ تدفین روضہ

شاہ علم اللہ میں ہوئی جہاں آخری جگہ باقی تھی۔ مجمع غیر معمولی تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے تھانیدار ایس پی کو رپورٹ دے رہا تھا کہ پونے دو لاکھ آدمی آچکے ہیں اور جوں جوں نماز کا وقت قریب آرہا تھا (موسم کی سختی' سردی اور شدید کہرے کے باوجود) آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور سلسلہ تو تدفین کے بعد تک جاری رہا' دور دراز کی گاڑیاں سحر تک آتی رہیں۔

''آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے''

حادثہ جمعہ کو پیش آیا۔ جمعرات کو ڈاکٹر عباد الرحمٰن نشاط صاحب نے (جو حضرت کے مجاز بھی ہیں) حج کے سفر کی بات رکھی تھی حضرت نے منظور فرمالیا تھا اور ارادہ کرلیا تھا۔ اس کی بھی حضرت کو بڑی فکر تھی کہ روپے پیسے جمع نہ رہیں جو آرہا ہے جاتا رہے۔ اس کے لیے بار بار بھائی عبدالرزاق کو آواز دیتے اور مولوی بلال اور مولوی محمود کو بھی تاکید کی کہ جہاں مناسب سمجھو بتادو، ہم دیں گے۔ اس طرح حضرت حج کے سفر کی نیت کر کے اور روزے کی حالت میں نماز کی تیاری اور انتظار میں، دیتے دلاتے اور اپنی عملی زندگی سے زہدہ عبادت واستغنا اور تعلق مع اللہ کی دعوت دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

نذر الحفیظ ندوی لکھنؤ

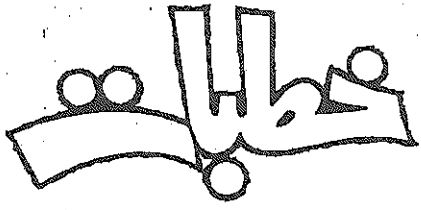
خطبات

مجموعہ محاسن وکمالات

قابل صد احترام مہمانان گرامی اور میرے عزیز بھائیو! یہ اجتماع مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی یاد میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ بزرگوں نے ارشاد فرمایا کہ عند الذکر الصالحین تنزل رحمۃ کہ جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور علماء کا ذکر کیا جاتا ہے اور اولیاء کا تذکرہ ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں اترتی ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک ادارے کا نام اور ایک اکیڈمی کا نام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس دور میں جہاں لوگوں کی قوتیں انتہائی کمزور اور ضعیف ہو چکی ہیں جب ہم حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات پر نگاہ ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں تو واقعتاً عقل حیران رہ جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے شافعی المسلک عالم اور محدث گزرے ہیں اور محدثین کے ہاں حافظ الدنیا کے لقب سے ان کو یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی شرح اور اس کا ایک مقدمہ لکھا۔ السعدی اساری کے نام سے تو اس مقدمے میں جہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھے اور ان کے کمالات کا تذکرہ کیا تو یہ شعر لکھا

ولیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں کہ دنیا کے تمام کمالات وفضائل کو ایک ہی شخصیت کے اندر جمع فرمادے۔ اس کے بعد محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف البنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنے استاد علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ لکھا تو انہوں نے بھی

ابتدا یہیں سے کی۔

ولیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

حقیقت یہ ہے کہ آج مولانا کے کمالات ان کی دینی تصنیفی اور ملک وقوم خصوصاً ملت اسلامیہ کے لیے ان کی خدمات کو دیکھا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے۔ واقعتاً اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس شخص کو مجموعہء کمالات بنایا تھا اور بہت سے فضائل ان کی ذات واحد میں جمع فرما دیے تھے۔

ابھی یہاں تذکرہ ہو رہا تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو شاہ فیصل ایوارڈ اور فلاں فلاں اعزازات سے نوازا گیا۔ یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہم مردہ پرست لوگ ہیں زندگی میں اپنے بزرگوں کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے' ان کی خدمات کو ہم قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے لیکن جب انتقال ہو جاتا ہے تو تذکرہ کرتے ہیں کہ ہمارے بزرگ یوں تھے اور ایسے تھے یہ بہت اچھی بات ہے کہ مختلف حکومتوں نے اور دنیا کے مختلف اداروں نے حضرت کی خدمات کا اعتراف کیا لیکن جیسا کہ ابھی حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کے مضمون میں بھی تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو کمالات عطا فرمائے تھے تو دنیا نے انہیں جن امتیازی نشانات سے نوازا تھا یا دنیا نے ان کی خدمات کے اعتراف میں جو انعامات اور اسناد پیش کی تھیں اس سے ان کی کچھ عزت افزائی نہیں ہوئی۔ ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو مقام عطا فرمایا تھا وہ اس قسم کی چیزوں سے بہت بلند تھا لوگ غالب کی فارسی شاعری کی تعریف کرتے تھے شاعر سمجھتے تھے لیکن اس کا اپنا خیال تھا۔

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فن ما

یعنی میں اپنے اس شاعرانہ مقام پر خوش نہیں ہوں۔ بات تو جب ہے کہ شعر خود یہ خواہش کرے کہ مجھے اپنے شاعرانہ فن کا حصہ بنا لیجیے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان رسمی امور سے

بہت بلند تھے اور ان کے قلب میں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملت اسلامیہ کے لیے جو درد ودیعت کیا تھا اور ان کے ذہن میں امت مسلمہ کے لیے جو فکر تھی حقیقت یہ ہے کہ وہ درد اور وہ فکر آج ہمارے معاشرے میں، کیا علماء اور کیا غیر علماء اور ہماری ملت کے قائدین میں بھی مفقود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں ایک ایسا دردمند اور پرسوز قلب ایک مضطر قلب عطا فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو جہاں کہیں بھی کچھ حالات پیش آتے ان کا وہ قلب انہیں تڑپا دیتا تھا وہ مسلمانوں کے احوال پر اپنے خاص انداز میں جو ان کا تھا اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ وہ کوئی عوامی سیاسی آدمی نہیں تھے۔ ان کا تعلق اہل علم سے تھا اپنے خاص انداز میں ان پر تبصرہ کرتے تھے۔ افغان مجاہدین کے لیے حضرت مولانا کی طرف سے یہ کتنا بڑا اخراج تحسین ہے کہ سعودی عرب کی جانب سے شاہ فیصل ایوارڈ کے سلسلے میں جو رقم ان کو ملی وہ رقم آدھی انہوں نے افغانستان کے مجاہدین کے لیے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ افغان مجاہدین کے جہاد کے لیے حضرت مولانا کی طرف سے ایک ایسا خراج تحسین ہے کہ دنیا کی دوسری چیزیں یا تعاون اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح سے تقسیم کے بعد انڈیا کے اندر ہندوستان میں مسلمانوں پر جو حالات گزر رہے تھے وہ ناقابل بیان تھے اس لیے کہ تقسیم ملک کے بعد جو لوگ تقسیم کے حامی تھے وہ پاکستان چلے آئے تھے اور ہندوستان کے وہ مسلمان جو دور دراز کے علاقوں میں تھے وہ بے سہارا رہ گئے ان پر کیا گزر رہی تھی اس کا آج باون سال کے بعد ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس وقت جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا کردار تھا اور اسی طریقے سے ہمارے دیگر اکابر اور بزرگوں کا کردار تھا ان مسلمانوں کی حفاظت اور ان کی دلجوئی کے لیے وہ جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا اور ان حضرات کے جانے کے بعد حقیقت یہ ہے کہ جہاں حضرت شیخ الاسلام کے صاحبزادے اس قسم کی خدمات انجام دیتے تھے یعنی مولانا سید اسعد مدنی۔ اسی طرح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کی خدمات میں مصروف تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے روشنی کی ایک کرن اور ہمت کا نشان تھے۔

جہاں مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھایا کرتے تھے وہاں مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحفظ کے لیے حضرت مولانا کی بہت بڑی خدمات تھیں اسی طرح جہاں مولانا کی تصنیفی خدمات ہیں وہاں اس کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی عملاً بھی خدمت کی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کل عربوں میں جو دینی رجحان پایا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ جہاں اس کے دوسرے اسباب ہیں اس میں حضرت مولانا کے قلم کا اور حضرت کے خطبات کا بھی بہت دخل ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب پورے عرب ممالک قومیت کے سحر میں مبتلا تھے اور مصر اس قومیت کے جذبے کو پورے عرب کے اندر ابھارنا چاہتا تھا اور ناصر ان کے ساتھ حسنین حیدر اور اس قسم کے دوسرے لوگ ایک طوفان کی طرح پورے عرب ممالک میں اس چیز کو پھیلانا چاہتے تھے اور ناصر کو نبی قومیت العربی کہا جاتا تھا اور عرب ممالک میں جتنے صحیفے (اخبارات) تھے جتنے دینی جرائد اور جتنی دینی صحافت تھی وہ بے چارے دین کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے فاضل بھتیجے حضرت مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ یہی وہ حضرات تھے کہ انہوں نے عرب قومیت کے اس سحر کا مقابلہ کیا اور عربوں کو بتایا کہ اگر تم کچھ ہو تو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ہو۔ عرب ہونے کی حیثیت سے ہمارے دل میں تمہارا کوئی مقام نہیں۔ گویا دوسرے امور کی وجہ سے ہم تمہاری عزت نہیں کرتے یا ہمارے دل میں تمہاری قدر نہیں ہے۔ ہم اگر عالم عربی کی تعریف کرتے ہیں ان کے گن گاتے ہیں تو صرف اس لیے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق عرب سے تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عربوں نے فضیلت پائی تھی۔ ''محمد عربی سے ہے عالم عربی''

اور پھر سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو شخصیت عطا فرمائی تھی اور جو کمال عطا فرمایا تھا اگر اس قلم سے اور اس کمال سے اور اس شخصیت سے وہ اپنا ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے تو حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے اس علاقے میں ان جیسا مالدار شخص شاید کوئی نہ ہوتا لیکن یہ ان کا کمال تھا جب ندوۃ العلماء کا پچاس سالہ جشن منایا جا رہا تھا تو ایک پروگرام میں

انہوں نے عرب ممالک کے سفیروں کو اور ان کے لوگوں کو جمع کیا تو ان کے سامنے اقبال کے یہ اشعار پڑھے کہ

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

یہ اشعار پڑھ کر انہوں نے کہا کہ دیکھو ہم اگر تمہاری تعریف کرتے ہیں، تمہاری عزت کرتے ہیں تو تمہارے ان ریالوں اور تمہاری اس دولت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ محمد عربی سے ہے عالم عربی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں صرف گفتار ہی کا غازی نہیں بنایا تھا بلکہ وہ کردار کے بھی غازی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جتنا بھی انہیں خراج تحسین پیش کریں اور جتنی بھی ہم ان کی تعریف کریں، حضرت مولانا کی شخصیت ان تمام چیزوں سے بہت اعلیٰ اور بہت ارفع تھی لیکن ظاہر ہے کہ جتنے آنے والے اس دنیا میں آتے ہیں وہ جانے کے لیے آتے ہیں۔ کسی عربی شاعر نے کہا تھا کہ

وکل ابن انثیٰ وانطال المسلم

ہر وہ بچہ جسے ماں جنتی ہے اگرچہ اس کی زندگی بڑی لمبی ہو جائے لیکن فیوم علی الجناز محول ایک نہ ایک دن وہ جنازے کی چارپائی سے اٹھایا جاتا ہے اور یہ وہ راستہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اس سے گزرے اور امت کے علماء اور صلحاء بھی اس سے گزرے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک بھرپور زندگی گزار کر اسی راہ پر تشریف لے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی قابل رشک زندگی تھی انہوں نے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب جو ان کے دوست تھے اور بعد میں جماعت اسلامی کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے

تھے اور جماعت اسلامی کا جو عربی لٹریچر ہے اس کی ابتدا مولانا مسعود عالم ندوی نے کی تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو حضرت نے ''پرانے چراغ'' میں جہاں ان کا تذکرہ لکھا ہے ان کے معاون علمی محمد عاصم الحداد کو خط لکھا اور یہ شعر اس میں لکھا۔

فسبقتنی و اخوک فی المضمار

جب ختم نبوت کے سلسلے میں مولانا جیل گئے تھے تو مولانا مسعود عالم ندوی نے یہ کہا

فسبقتنی و اخوک فی المضمار

ایک عرب شاعر کا شعر ہے تو حقیقت کہ اب مولانا ہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ سبقت کر کے تشریف لے گئے اور ہم حیات کے اس چکر میں پھر رہے ہیں' بیٹھ رہے ہیں' اٹھ رہے ہیں' زندگی گزار رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بزرگوں کو تو خراج تحسین کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلیں اور ان کی زندگی کے طور طریقے اختیار کریں اور ان کی خدمات کا عکس ہماری زندگی میں نظر آئے جیسی زندگی انہوں نے گزاری تھی اس کا کچھ عکس ہماری زندگی میں نظر آئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مولانا کے پسماندگان کو حضرت مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی حضرت کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی

علی میاں ——— ایک عظیم شخصیت

جناب صدر، بزرگان محترم، معزز ساتھیو! حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد میں اپنے دل میں ملال محسوس کر رہا تھا کہ اس عظیم شخصیت کو جو خراج عقیدت پیش کرنا چاہیے تھا اور اس قسم کی عظیم شخصیت کا جو ہم پر حق تھا ہم اس میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ ایسے حالات تو نہیں ہیں کہ ہم ان کے گھر جا کر ان کے خاندان اور پس ماندگان سے تعزیت کا اظہار کریں لیکن اس قسم کی شخصیات صرف اپنے خاندان کی نہیں بلکہ پوری امت کا اثاثہ اور متاع عزیز ہوتی ہیں۔ ہر شخص ان کے بارے میں تعزیت کا مستحق ہوتا ہے۔ آج جب میں ڈھاکہ سے کراچی پہنچا تو آج ہی اسلام آباد کے لیے روانگی تھی لیکن ائیر پورٹ پر جب مجھے بتایا گیا کہ مفتی محمود اکیڈمی کی طرف سے حضرت علی میاں رحمہ اللہ کے بارے میں ایک سیمینار منعقد ہو رہا ہے تو میں نے اسے اپنے لیے غنیمت سمجھا کہ اپنے دل کی تسلی کے لیے اس میں شامل ہو کر کم از کم وہ ملال تو دور کروں کہ اس عظیم شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے سے اب تک میں کیوں محروم ہوتا چلا آیا۔ اس حوالے سے میں مفتی محمود اکیڈمی کے کار پرداز خصوصی طور پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری صاحب، برادر مکرم فاروق قریشی صاحب اور ان کے دیگر رفقاء کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے بہر حال ایک کوشش تو کی کہ حضرت مرحوم کا کسی درجے میں حق ادا کیا جا سکے۔ گو کہ وہ اتنی عظیم شخصیت تھی کہ ہمارے یہ چھوٹے موٹے اجتماعات اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ شاید ان کی تعزیت کا حق ادا نہ کر سکیں۔ بہر حال شخصیات اور عظیم شخصیات جب دنیا میں آتی ہیں تو یہاں رہنے کے لیے نہیں آتیں یہاں سے جانے کے لیے آتی ہیں

اور کچھ شخصیات ہوتی ہیں جو دنیا میں رہنے کا اپنا فرض پورا کر کے رخصت ہو جاتی ہیں۔ ان کی زندگی آنے والوں کے لیے ایک امانت بن جاتی ہے اور اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی زندگی گزاری ہم اس مقصد کا تحفظ کس طرح کر سکتے ہیں۔

انبیاء کرام بھی دنیا میں تشریف لائے اور اپنے عظیم الشان مشن کی تکمیل کے بعد دنیا سے چلے گئے لیکن مشن اپنی جگہ برقرار اور مقصد اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ سب سے بڑی بات ایک کامل اور مکمل انسان صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی جب یہ افواہ پھیلائی گئی کہ شہید کر دیے گئے ہیں صحابہ کرامؓ کی جماعت میں بہت سے مایوس ہو کر بیٹھ گئے' کسی نے تلوار پھینک دی' کسی نے تلوار توڑ دی تو اللہ رب العزت نے اس جماعت کو جھنجھوڑا اور احساس دلایا کہ انبیاء تو پہلے بھی آئے تھے چلے گئے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کا پیغام لے کر آئے ہیں اور فریضہ مکمل کر کے دنیا سے تشریف لے جائیں گے۔ تو کیا ان کے رخصت ہونے کی صورت میں تم اپنے مقصد سے پیچھے ہٹ جاؤ گے؟ ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا' اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ شخصیات کی اہمیت اپنی جگہ پر شخصیات کی اہمیت بھی ایک مقصد سے وابستگی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جب غزوۂ احد میں مسلمانوں کو مشکل کا سامنا کرنا پڑا اور کفار مکہ بظاہر اپنے آپ کو فاتح سمجھنے لگے تو ابوسفیان جو اس وقت لشکر کفار کا سربراہ تھا' سردار تھا' اس نے آواز دی۔ ''افیکم محمد'' صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ ہم کیا جواب دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لا تجیبوا!'' جواب مت دو۔ تو انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آواز دی۔ ''افیکم ابو بکر؟'' صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جواب کے بارے میں پوچھا' حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''لا تجیبوا'' یہ کہا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ تو آیا لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت تھی اور ان کا حکم یہ تھا کہ جواب مت دو اس لیے

خاموش رہے۔ جب اس کا (ابوسفیان) خیال ہوا کہ اب یہ شخصیتیں نہیں رہیں تو اس نے ''اُعلُ ھُبل'' کا نعرہ لگایا۔ صحابہ کرام نے پوچھا اب کیا جواب دیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اب جواب دو کہ ''اللہ اعلیٰ و اجل'' پھر اس نے نعرہ لگایا ''لنا العزی و لا عزی لکم'' حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اب جواب دو کہ ''اللہ مولانا و لا مولا لکم'' اس واقعہ پر جب آپ نظر ڈالیں تو میرے خیال میں اس سے ایک درس ملتا ہے وہ یہ کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام شخصیات کے حوالوں سے نعرہ کا جواب دے دیتے تو تعلیم یہ ملتی کہ اگر شخصیتیں ہیں تو دین ہے اور اگر یہ شخصیتیں نہیں رہیں گی تو عقیدہ اور دین ختم ہو جائے گا لیکن جب عقیدے کے حوالے سے اس نے آواز بلند کی تو فرمایا اب جواب دو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس طرز عمل سے ہمیں یہ سبق اور تعلیم دی کہ شخصیات آج ہیں کل نہیں ہوں گی لیکن مقصد برقرار رہے گا۔ اس عظیم مقصد کا تحفظ آپ لوگوں نے کرنا ہے۔ اس دین نے قیامت تک زندہ رہنا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ان عظیم شخصیات میں سے تھے جہاں ندوۃ العلماء میں انہوں نے علمی خدمات سرانجام دیں۔ وہاں تصنیف و تالیف کے ذریعے علمی خدمات کو پوری دنیا میں پھیلایا اور اتنا بڑا قد پیدا کیا کہ اہل علم ہی نہیں اسلامی دنیا کے حکمران بھی ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھے، ہر حلقے میں ان کی علمی عظمت کا اعتراف کیا گیا۔

۱۹۸۰ء میں جب دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جشن منایا گیا حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ علیہ کے ساتھ میں بھی چلا گیا اب وہاں علی میاں کے نام سے ایک نام لیا جاتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ نام تو بڑا چھوٹا موٹا ہے لیکن بڑے بڑے لوگ اس نام کو زبان پر لاتے ہیں یہ کیا شخصیت ہے معلوم کیا تو کہنے لگے کہ یہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نام ہے اور اس حوالے سے اس نام سے میں واقف تھا لیکن اس شخصیت سے میں واقف نہیں تھا کہ یہ شخص ہے کون؟ لیکن جب دارالعلوم دیوبند کے اس صد سالہ جشن کے اسٹیج پر جب اس شخصیت کو اور اس کے احترام کو دیکھا

تو خوشگوار حیرت ہوئی۔ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب اس جلسہ سے خطاب کر رہے تھے تو انہوں نے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تقریر کا حوالہ دیا جس میں دارالعلوم دیوبند کے حوالے سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ان میں کچھ اصول بیان کیے تھے۔ جو علی میاں نے بیان کیے تھے اس کا حوالہ دیتے ہوئے جب مفتی صاحب کی تقریر میں نے سنی تو پھر ان کی شخصیت اور زیادہ بڑھتی چلی گئی۔ بعد میں تو براہ راست ملاقات بھی ہوئی اور تفصیلی گفتگو کا شرف بھی حاصل ہوا اور بہرحال یہ عظیم شخصیتیں اپنی ذمہ داری پوری کر کے دنیا سے چلی گئیں اور غالباً اس وقت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے خطاب کا حوالہ دے کر تقریر کی اور یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے حوالہ سے یہ صد سالہ جشن صرف ہندوستان میں نہیں ہونا چاہیے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان میں بھی ہونا چاہیے لیکن پھر اسی سال حضرت مفتی صاحب رحلت فرما گئے اور وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اب جمعیت علماء اسلام نے اس پر کچھ فیصلہ کیا ہے کہ اگلے سال تک دارالعلوم دیوبند کی ڈیڑھ سو سالہ خدمات کانفرنس کا انعقاد کیا جائے اور اس میں برصغیر کے تمام جید علماء کرام کو دعوت دی جائے۔ آپ حضرات دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ جمعیت علماء اسلام کو اس میں کامیابی نصیب فرمائے۔ صوبہ سرحد کی جمعیت علماء اس کی میزبان بننا چاہتی ہے اور انہوں نے اس بارے میں کچھ فیصلے بھی کیے ہیں۔ یہ ساری محنتیں درحقیقت اس فکر کو اس نظریے کو اس عقیدے کو برقرار رکھنے کے لیے ہوئی ہیں اور یہ پس ماندگان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس حوالہ سے کام کریں۔ ان اکابر کا تذکرہ کریں ان کی شخصیت کو زندہ رکھیں ان اداروں کو زندہ رکھیں۔

ہندوستان میں جب تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ غالباً چار قسم کے ادارے وجود میں آئے ایک علی گڑھ' جہاں خالصتاً انگریزی نصاب تعلیم کو رواج دیا گیا' ایک دارالعلوم دیوبند تھا' جہاں خالصتاً دینی علوم کو رواج دیا گیا۔ لیکن لکھنؤ کے ندوۃ العلماء نے قدیم اور جدید کی درمیانی خلیج کو پاٹنا اپنا مقصد قرار دیا اور چوتھے قسم کا ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جس نے عصری اور دینی

تعلیم کے ساتھ قومی و ملی فکر کی تربیت اور اسلامی سیرت کی تشکیل پر زور دیا غالباً یہ چاروں ادارے اپنے منہج پر پورے انہماک کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی گو کہ وہ ندوۃ علماء سے وابستہ تھے لیکن انہوں نے علوم کی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے کی اور دارالعلوم دیوبند کے اکابر سے نسبت پیدا کی۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا سلسلہ بھی رکھا۔ قرآن و حدیث کے علوم بھی وہاں سے حاصل کیے ان کو ہم اپنے اکابر کی صف میں ایک اہم اور عظیم شخصیت کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ اللہ رب العزت ان کی دینی، علمی اور تبلیغی خدمات کو قبول فرمائے اور اس حوالے سے جو مقالات یہاں پڑھے گئے اس میں ان کی شخصیت کو جس انداز سے روشن کیا گیا ہے، میں ان مقالات کے ہوتے ہوئے بھی کچھ کہوں یہ ان کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ مجھے سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ حضرت مولانا کی یاد میں جس سیمینار کا اہتمام کیا گیا ہے مجھے اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور یہ میں اپنے لیے ایک بہت بڑی نعمت تصور کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو قبول فرمائے اور اکابر کے مشن اور مقصد کو اور ان کی خدمات کو قیامت تک زندہ رکھیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مولانا فضل الرحمٰن

امیر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

قطعہ تاریخ وفات

(فقید عالم اسلامی مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندویؒ)

آفتابِ لاجوابِ علم رُخصت ہوگیا

ایسا صدمہ جھیلنا پڑتا ہمالہ کو اگر
ریزہ ریزہ اس کا ہو جاتا فضا میں منتشر
کم نہ تھیں آفات پہلے ہی دلِ ناشاد پر
اور اس پر انتقالِ ندویؒ والا گہر
خرمن ہوش و خرد پر صاعقہ بن کے گری
ہوگیا شل جسم، سن کے ان کی رحلت کی خبر
کون ہے اس شہر میں جو ان کا گرویدہ نہیں
''ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر''
صرف دہلی، لکھنؤ، لاہور ہی غمگیں نہیں
ہے فسردہ مکہ و جدہ، مدینہ الخبر
داعیِ اسلام تھے پھر ان کا ماتم کیوں نہ ہو
''نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر''
اے نعیم دل شکستہ یہ ہے تاریخ وفات
آفتابِ علم دیں، جادو قلم، نورِ بصر

سید نعیم حامد علی الحامد، مدینہ المنورہ

مکتوبات

گزارش احوال

تجویز تو بہت دنوں سے تھی کہ میرے پاس مصصام الاسلام پر مولانا مرحوم کا لکھا ہوا جو تبصرہ ہے اور اس سلسلے کی اور دیگر جو خط و کتابت ہے وہ شائع کر دی جائے۔ مگر اس کا ابھی شاید وقت نہیں آیا تھا۔ جواب آ گیا ہے۔ مولانا کی بڑی خواہش تھی کہ پوری کتاب شائع کی جائے۔ میں نے بھاگ دوڑ بھی کی۔ یہاں تک کہ لاہور بھی گیا اور شیخ نیاز احمد صاحب (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور) اور دیگر اشاعتی اداروں سے گفتگو بھی کی مگر نتیجہ کچھ نہ بدلا۔ بدقسمتی سے وقت اور حالات نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ ۴۳۶ صفحات اور فل اسکیپ سائز ۷×۱۱ کی کتاب دوبارہ شائع کی جائے۔ پھر اس کی زبان موجودہ زمانے کے مطابق نہیں۔ بہر حال اس بات پر اتفاق کر لینا پڑا کہ تبصرہ چند صفحات کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ تبصرہ کی فوٹو کاپی اور ایک باب کی فوٹو کاپی فضل ربی صاحب کو دے دی گئی تھی۔ جو انہوں نے ابھی تک شائع نہیں کی۔ بہر حال قارئین کی دلچسپی اور علم کے لیے ''مصصام الاسلام'' پر مولانا علی میاں کا صرف دیباچہ اس مجموعے میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ مولانا کی یہ نادر اور یادگار تحریر ضائع ہونے سے بچ جائے۔

اصل کتاب جو نہایت خستہ حالت میں تھی۔ بعض صفحات ہاتھ لگانے سے بکھر جاتے تھے انہیں درست کر کے مضبوط کیا گیا اور کتاب کی تین فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنائی گئیں۔ دو کاپیاں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی لائبریری میں محفوظ کرا دی گئیں اور ایک کاپی برادرِ عزیز سید جمیل

احمد حسنی مرحوم نے لے لی جو صمصام الاسلام پڑھنے کے بڑے شوقین تھے اور انہیں کے ذریعے کتاب کی درستگی اور فوٹو کاپیاں کی گئی تھیں۔

اصل کتاب درستگی اور اچھی جلد بندی کے بعد کتاب کی مالکہ ہمیشرہ عزیزہ محترمہ حفصہ ضیاء (منی بی صاحبہ) اہلیہ حافظ سید محمد ضیاء حسنی مرحوم کو واپس کر دی گئی۔

وہ خطوط جو میں نے مولانا کو لکھے ان کی نقول میں نہ رکھ سکا سوائے دو خطوں کے جو شامل کیے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا مرحوم و مغفور کے نام میرے دو خط اور ہیں جن کی فوٹو کاپیاں کرا کے رکھ لی تھیں، شامل ہیں۔

خاندان میں جن لوگوں کے پاس مولانا کے خطوط برابر آتے تھے، ان میں سرفہرست ان کے خاص الخاص دوست اور عزیز اور میرے پھوپھی زاد بھائی برادر محترم سید احمد الحسنی صاحب مرحوم تھے (دیکھئے: پرانے چراغ، حصہ سوم، صفحہ ۲۵۵)۔ ان کے دوسرے چھوٹے بھائی برادر عزیز سید ابراہیم حسنی صاحب، محترم قاری سید رشید الحسن صاحب اور یہ خاکسار۔

افسوس کہ برادر عزیز سید ابراہیم حسنی صاحب نے کوئی خط محفوظ نہ رکھا۔ عزیزی محمد حسنی (مم میاں) نے اپنے والد گرامی سید احمد الحسنی صاحب کے صرف دس خطوط کی کاپیاں فراہم کیں۔ محترم قاری سید رشید الحسن صاحب نے بھی تقریباً دس خطوط دیے۔

تقریباً دس سال ہوئے ''تعمیر حیات'' میں ایک اپیل شائع ہوئی کہ حضرت مولانا صاحب کے لکھے ہوئے جن لوگوں کے پاس خطوط ہوں وہ ازراہِ عنایت واپس کر دیں تاکہ ریکارڈ پر آ جائیں اور ضائع نہ ہو جائیں۔ اس اپیل پر میں نے اپنے سارے خطوط حمزہ سلمہ ابن مولانا محمد ثانی مرحوم کو واپس کر دیے۔

ان خطوط کی واپسی کے بعد میں نے بعد کے آنے والے مولانا کے خطوط پھر محفوظ کرنا شروع کر دیے کچھ گم بھی ہوئے ہوں گے۔ واپس ہونے والے خطوط ان خطوط سے کہیں زیادہ تھے، جو اب شائع ہو رہے ہیں اور صرف خاندان کے تین اشخاص تک محدود ہیں۔

اس مجموعہ میں میرے عزیز ترین دوست مولانا محمد ثانی حسنی مرحوم کی تعزیت کا خط بھی شامل ہے جس کی فوٹو کاپی میں نے منگالی تھی۔ میری اور مولانا محمد ثانی کی دوستی بالکل ایسی ہی تھی جیسے مولانا اور میرے پھوپھی زاد بھائی محترم سید احمد الحسنی کی۔

میں بہت ہی معمولی اور گمنام آدمی ہوں۔ مفتی محمود اکیڈمی کے تعزیتی جلسہ میں مجھ سے بھی کہا گیا کہ آپ بھی کچھ کہیں۔ بلکہ جلسہ کی ابتدا مجھ ہی سے کرائی گئی۔ میں اس کا اہل نہیں تھا۔ بہرحال جلدی میں مولانا کے تعلق سے ''کچھ یادیں..... کچھ باتیں'' کے عنوان سے کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حسین حسنی

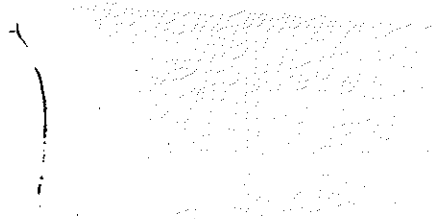

خطوط بنام سید احمد حسنی

مکتوب الیہ: سید احمد الحسنی کے والد کی والدہ مولوی حکیم سید فخر الدین خیالی مرحوم (مولانا علی میاں کے دادا) کی چچا زاد بہن تھی۔ اس طرح (سید احمد الحسنی کے والد) حکیم سید عبدالحئی صاحب (مولانا علی میاں کے والد) کے پھوپھی زاد بھائی ہوتے تھے۔

(۱)

دوحہ۔قطر

۱۲محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

ادسمبر ۱۹۷۹ء

برادر عزیز احمد سلمہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ تم اور سب اعزا بخیر و عافیت ہوگے۔ ابھی چار پانچ دن ہوئے مولانا ہاشم مجددی صاحب نے تمہارا خط دیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آج کل لاہور میں ہیں۔ تمہارا خط اجتباء کے متعلق آیا تھا۔ ہم ان دنوں بہت مصروف تھے اور حجاز و قطر کے سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ اجتباء لاہور سے آنے کے بعد دو چار ہفتہ ٹھہر کر ریاض چلے گئے۔ وہاں سے کاغذات براہِ راست آ گئے تھے۔ لاہور میں ان کا انتظار کرنا پڑا اور بہت پریشان ہوئے۔ ان کو خواہ مخواہ دوڑا دیا بہر حال اب وہ ریاض پہنچ گئے ہیں۔

اس سفر میں محمد میاں مرحوم کے بڑے بیٹے عبداللہ سلمہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ڈھائی تین

دن مکہ معظمہ رہے۔ وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو تم کو معلوم ہے۔ وہاں سے موتمر السیرۃ میں شریک کرنے اس نیت سے آئے تھے کہ اس سے فارغ ہو کر واپس جائیں گے اور دو ہفتہ رہ کر ہندوستان واپس ہوں گے لیکن حالات ابھی درست نہیں ہوئے۔ اس لیے دوستوں کا مشورہ ہوا کہ بس سے واپس جائیں۔ دوحہ میں عباس میاں کے لڑکے عمر میاں سے ملاقات ہوئی، ان کے گھر گئے، کھانا بھی کھایا، ان کے بچوں کو بھی دیکھا، تم لوگوں کی خیریت معلوم ہوئی۔ ایک تصنیف کے دوران تمہاری دی ہوئی اردو انسائیکلو پیڈیا سے بہت فائدہ اٹھایا۔ تم نے اچھا کیا کہ ''تناقض تحارفیه العیون'' کا ایک نسخہ مناسب ولائق آدمی نذیر حسین صاحب کو پیش کر دیا۔ ہم کل انشاء اللہ بمبئی کے لیے روانہ ہوں گے۔ یہ خط تم کو شاید دو تین ہفتہ کے بعد ملے کیونکہ مجددی صاحب ابھی مدینہ منورہ جائیں گے لیکن وہ ہندوستان سے بھیجے ہوئے خطوں کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ ہے۔ گھر میں سب کو سلام و دعا۔ برادران عزیز سید ابراہیم و سید اسحاق کو بھی سلام پہنچا دو۔ ان کو براہ راست لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ سلام

تمہارا ابوالحسن علی ۱۲ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

میرا بھی سلام قبول فرمائیں اور دعا کی درخواست۔ (راقم عبداللہ)

(۴)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ الہند

۱۶ دسمبر ۱۹۷۹ء

برادر عزیز احمد سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ تم مع اعزا و متعلقین بخیر و عافی ہو گے۔ نومبر کی آخری تاریخوں میں دوحہ (قطر) میں تیسری عالمی سیرت کانفرنس تھی۔ وہاں شیخ ہاشم مجددی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے تمہارا خط دیا اور تم سے بہت تعلق اور اعتماد کا اظہار کیا، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ لاہور تمہارے ہی شعبے میں آ گئے ہیں۔ ہم نے خط کا جواب لکھ کر انہی کے حوالہ کیا لیکن وہ کہتے تھے کہ ہم دو ہفتہ طیبہ ٹھہر کر جائیں گے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ مدت اور بڑھا دی ہو کہ ادھر ہمارے عزیز مصرف دوست شیخ عبدالکریم سلیمان جو یہاں استفادے اور افادے دونوں میں مشغول ہیں اور بڑے صحیح الخیال اور داعی قسم کے آدمی ہیں۔ اپنی ایک ضرورت سے پاکستان جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر تم کو یہ خط لکھ رہے ہیں کہ شاید دوحہ کے خط سے پہلے مل جائے۔ تم ان سے مل کر خوش ہو گے اور دارالسلام کے اور ہم لوگوں کے تازہ حالات معلوم ہوں گے۔ ان کا کام وہاں کے ہندوستانی سفارت خانے سے متعلق ہے۔ ان کو اسلام آباد بھی جانا ہے۔ عزیزی اسحاق سلمہ کو خط لکھ دینا شاید ان کو کچھ سہولت ہو۔ کانفرنس میں ہماری کتاب 'سیرت النبویہ' مہمانوں کو پیش کی گئی۔ اس کو وہاں کی حکومت نے برائے تقسیم و ہدیہ اہتمام سے چھپوایا ہے۔ ایک نسخہ تم کو بھیج رہے ہیں کہ پہلی طباعت اچھی نہ تھی۔ ہمارے سب بھتیجے، بھانجے اور ان کے بچے الحمدللہ بخیر و عافیت ہیں۔ اپنے گھر میں نیز ابراہیم و اسحاق اور ان کے بچوں کو سلام دعا۔ دوحہ میں عباس میاں کے لڑکے عمر میاں برابر ملتے رہے اور ایک مرتبہ ان کے گھر بھی گئے۔

والسلام

تمہارا بھائی علی

(۴)

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی
۲/۴/۸۰

برادر عزیز احمد سلمہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ تم مع متعلقین بخیر و عافیت ہو گے۔ تمہارا خط شیخ ہاشم مجددی نے ہمیں مکہ معظمہ میں دیا تھا اور وہیں خیال تھا کہ تم کو ڈاک سے خط لکھیں گے لیکن تمہارا خط ساتھ لیے لیے پھرے خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ ریاض میں تمہارا خط اجتباء کے نام دیکھا۔ ۲۴ فروری کو جو سفر شروع ہوا تھا وہ بہ مشکل ۲۴ مارچ کو ختم ہوا۔ تمہاری یاد مختلف طریقوں سے آتی رہی، کل اچانک معلوم ہوا کہ عزیزی عیسیٰ سلمہ پاکستان جارہے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ لاہور ٹھہرو گے اور احمد کا مکان جانتے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر خط اور تعمیر حیات کا خصوصی نمبر جس میں تینوں مرحومین پر مضامین تم کو بھیج رہے ہیں۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھو گے اور پسند کرو گے۔

پہلے بھی ہم نے تم کو لکھا تھا کہ دنیا ہندوستان آتی ہے۔ دیوبند کے اجلاس میں آئی۔ سو پاکستانی آئے تھے۔ اگر تم بھی اپنے عزیزوں سے ملنے اور بھانجوں اور بھتیجوں کے بچوں کو دیکھنے آجاؤ تو کیا بڑی بات ہے۔ تم نے حماسہ کا شعر پہلے بھی پڑھا ہوگا۔

اذا زرت ارضا بعد طول احتبادیها

فقدت صدیقی' والبلاد کماهیا

البتہ آنے سے پہلے یہ ضرور اطمینان کر لینا کہ ہم ہندوستان میں ہیں یا نہیں۔ گھر میں سب سے سلام کہو، ابراہیم و اسحاق کو بھی سلام پہنچا دینا۔ والسلام

تمہارا بھائی
ابوالحسن علی
بقلم ناصر الاسلام

(۴)

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

میدان پور

۳۱ جولائی ۱۹۸۰ء

برادرِ عزیز اعز سید احمد سلمہ اللہ تعالیٰ!

اللہ کی ذات سے امید ہے کہ تم مع متعلقین وافراد خاندان بخیر وعافیت ہوگے۔ ہم یہ خط تم کو میدان پور سے لکھ رہے ہیں۔ یہاں تین چار رمضان سے خاندان سے لوگ پناہ گزیں تھے ہم کو بھی مجبوراً تکیہ چھوڑنا پڑا کہ پانی گھروں میں داخل ہوگیا تھا اور جمعہ وتراویح بنگلہ پر پڑھنا ممکن نہ رہی۔ تمہیں پچھلے منظر یاد ہوں گے جب ہم لوگ کبھی میدان پور میں اور کبھی شہر میں پناہ گزیں ہوتے تھے۔ پانی کا ایک سمندر پھیلا ہوا ہے اور شہر اور تکیہ کشتی سے جانا پڑتا ہے۔ ذرا تفصیل سے یہ نقشہ بیان کر دیا ہے کہ پرانی یادیں تازہ ہو جائیں۔ سب گھروں کے لوگ شہر میں ہیں اور ہم اپنے رمضانی مہمانوں کے ساتھ میدان پور کے نوتعمیر مدرسہ ضیاء العلوم میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے برادرم ابوبکر بھی دہلی سے آئے ہوئے تھے وہ بھی پھنس گئے۔ باقی خاندان والے الحمدللہ محفوظ ہیں۔

ہمارا یہ خط یحییٰ عثمان صاحب پیش کریں گے۔ یہ لکھنؤ صیحتا باغ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے لڑکے دارالعلوم میں پڑھتے ہیں اور ماشاء اللہ جامع اسلامیہ مدینہ منورہ میں ہیں اور ایک ابھی دارالعلوم میں۔ ان کے داماد جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ میں ہیں۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کو بلایا ہے اور اس کارروائی کا تعلق تمہارے کلچرل آفس سے ہے۔ وہ کاغذات پیش کر دیں گے۔ تمہاری موجودگی ان کے لیے ان شاء اللہ ہر طرح کی سہولت کی باعث ہوگی۔ ان کے گھر سے بڑے تعلقات ہیں۔ امید ہے کہ تم خاص خیال کروگے۔ مولانا ہاشم مجددی صاحب اگر ہوں تو

ان سے بھی تعارف کرادینا۔ گھر میں درجہ بدرجہ سلام دعا کہو۔ ہمارے بھانجے محمد ثانی سلمہٗ بھی پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور سلام کہتے ہیں۔

ایک ضروری بات یہ ہے کہ دیوبند کے جلسہ میں جو مارچ کے آخر میں ہورہا تھا سید نفیس رقم صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے معلوم ہوا تھا کہ ہماری کتاب ''کاروانِ ایمان و عزیمت'' بس بالکل تیار ہے ہم نے ان کو خط بھی لکھا لیکن نہ کتاب آئی نہ جواب لکھا۔ تم ذرا تکلیف کر کے یہ معلوم کرو کہ کتاب کس مرحلے پر ہے اور کب ملے گی۔ والسلام

تمہارا بھائی

ابوالحسن علی ندوی

(۵)

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۱۷ شوال المکرم ۱۴۰۰ھ

برادرِ عزیز واعزا احمد سلمہ اللہ وحفظہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تم بھی کہو گے کہ علی بھیا نے اچھا راستہ دیکھ لیا۔ جہاں کوئی کام پیش آیا ایک حکم نامہ جاری کر دیا مگر کیا کریں تمہیں تکلیف نہ دیں تو کس کو دیں؟ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا حصہ چہارم بالکل صحیح وقت پر اور صحیح طریقہ پر شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب کو پہنچ گیا۔ فیصل آباد سے ان کا خط آیا اور سہارنپور پہنچ کر بھی انہوں نے لکھا۔ کتاب میں طباعت کی غلطیاں اور خود مصنف سے بھی کچھ تسامح ہو گیا ہے۔ ہماری ہر کتاب مجلس نشریات اسلام۔ ناظم آباد کراچی کے ناظم عزیزی فضل ربی ندوی آفسٹ سے فوراً چھاپ دیتے ہیں اور اس کتاب کی تو تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آفسٹ میں ہر غلطی جوں کی توں چھپ جاتی ہے ہم نے پوری کتاب لفظ بہ لفظ پڑھی ہے۔ جو نقطے غلط ہو گئے تھے ان کو بلیڈ سے چھیلا آیات کی زیر وزبر قلم سے ٹھیک کیے۔ اگر کہیں لفظ یا جملہ غلط ہو گیا تھا تو اس پر کاغذ کی چپی لگا کر دوبارہ سیاہ روشنائی سے خوشخط لکھوایا۔ غرض کتاب کی نوک پلک درست کی اور اب وہ نسخہ آفسٹ سے چھپنے کے قابل ہو گیا ہے۔ ایک صاحب سے جو کراچی جانے والے تھے، طے تھا کہ وہ خود قاری رشید الحسن کے مکان پر جا کر نیوٹاؤن پہنچا دیں گے لیکن وہ بعض حالات کی وجہ سے اس شہر میں بھی نہ آ سکے جہاں وہ اپنے اعزا سے ملنے آئے تھے۔ اب اللہ نے ایک دوسرا ذریعہ پیدا کر دیا۔ یہ افغانی دوست ہم سے رائے بریلی میدان پور ملنے آئے تھے، جہاں ہم بھی سیلاب کی وجہ سے پناہ گزیں ہیں۔ ہم نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ تم سے مل کر کتاب تمہارے حوالہ کر دیں۔ تمہارے دفتر اور مکان دونوں جگہ کا پتہ دے دیا۔ اس کتاب پر جتنی

محنت ہوئی ہے وہ کسی چھوٹی تصنیف سے کم نہیں۔ اگر کوئی معتبر عزیز (پھوپھا میاں مرحوم کے معیار کے مطابق) ایک دو روز میں کراچی جا رہا ہو تو بڑے قول وقرار کے بعد اس کے حوالے کرنا، ورنہ رجسٹری سے قاری رشید الحسن صاحب کو جن کے نام مفصل خط بھی اس کتاب میں رکھا ہوا ہے اپنے خط کے ساتھ بھیج دینا۔ یہ کتاب علی بھیا نے تصحیح کر کے بھیجی ہے جس کو فوراً فضل ربی ندوی کو پہنچا دو۔ قاری رشید الحسن کا پتہ تو تم کو معلوم ہی ہے۔ خطیب و امام جامع مسجد نیو ٹاؤن کراچی۔ فضل ربی ندوی کا پتہ بھی احتیاطاً لکھ دیتے ہیں کہ بعض دفعہ ضرورت پڑ جاتی ہے۔

مولوی فضل ربی ندوی مجلس نشریات اسلام ا۔ کے، ۳ ناظم آباد نمبر ا کراچی

ایک تکلیف یہ کرنا کہ جب یہ کارروائی مکمل ہو جائے تو ایک کارڈ لکھنؤ کے پتہ پر (پوسٹ بکس ۹۳ ندوی، لکھنؤ) بھیج دینا۔ لاہور کا خط جلد مل جاتا ہے۔

کتاب کا ایک نسخہ تمہارے لیے اور ایک نذیر صاحب کے لیے بعد میں بھیجیں گے۔ تاکہ اشتباہ نہ ہو جائے اور غیر تصحیح شدہ نسخہ کراچی اور تصحیح شدہ نسخہ لاہور نہ رہ جائے۔ پھوپھا میاں کا شک تم جانتے ہو۔ یہ ترکہ ہم کو بھی ملا ہے۔ لاہور سے بھیجا ہوا خط جلد مل جاتا ہے۔ ان شاء اللہ ہم کو اطمینان ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ہمارا پہلا کارڈ مل گیا ہوگا جس میں ہم نے تم سے تیس (۳۰) چالیس (۴۰) سال سے یہاں نہ آنے کی شکایت کی تھی۔ گھر میں سب کو سلام و دعا کہو۔ ابراہیم اسحاق کو بھی ہمارا سلام پہنچا دینا۔ ہم سب کے لیے برابر دعا کرتے ہیں۔ والسلام

تمہارا بھائی

ابوالحسن علی ندوی

۲۸ اگست ۱۹۸۰ء

(۶)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ الہند

۸۴/۱۲/۱۵

برادر عزیز واعز احمد سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ تم مع اہل خانہ بخیر وعافیت ہو گے۔ ادھر چند ہفتوں سے تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک کارڈ آیا تھا جس میں تم نے اپنے کراچی کے سفر وقیام کا ذکر کیا تھا۔ عزیزی فضل ربی آئے ہوئے ہیں اور دو چار دن میں واپس جانے والے ہیں۔ ہم اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے تم کو خط لکھ رہے ہیں۔ وہ کراچی سے پوسٹ کر دیں گے۔

ظفر علی قریشی صاحب کا خط کل کی ڈاک سے بھی آیا۔ ان تک یہ پیغام پہنچا دو کہ ان کے خطوط پہنچ گئے۔ ہم نے ان کے معاملے کو ذہن کے صفحے پر نوٹ کر لیا ہے۔ ان کا خط بھی ساتھ لے جا رہے ہیں تا کہ یاد دہانی کرائیں۔ خدا کرے کوئی کامیابی اس سلسلے میں ہو۔ اگر ریاض کے دوستوں میں سے کوئی مل گیا تو ان شاء اللہ ان کے معاملے کی طرف پوری توجہ دلاؤں گا۔ ۲۶ دسمبر کو ہمارا حجاز کا پروگرام ہے۔ جنوری کے تیسرے ہفتہ میں ان شاء اللہ واپسی ہو گی۔ عامر سلمہ کے یہاں سے دعوت نامے آئے تھے۔ ہم نے رسید اور شکریہ کا خط لکھ دیا ہے۔ موقع ہو تو تم بھی کہہ دینا لیکن تمہارے ہاں آنے کی تاریخ سعید کب آتی ہے برادران عزیز ابراہیم و اسحاق سے سلام کہو۔ کبھی وہ لوگ اپنی خیریت کے دو حروف نہیں لکھ دیتے۔

تم کو ایک تحفہ ''رسائل الاعلام'' بھیج رہے ہیں۔ مشاہیر عرب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو ہمارے نام ہیں۔ اس میں شیخ تقی الدین ہلالی کے خط میں صفحہ ۲۰ پر تمہارا ذکر ہے اور تعارف میں ہمارا حاشیہ ہے۔ پڑھنے کے بعد شیخ نذیر حسین کو بھی مطالعہ کے لیے دینا۔ امید ہے کہ محظوظ ہوں گے۔ والسلام

تمہارا بھائی

ابوالحسن

(۷)

مدینہ منورہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ

برادر عزیز واعز سلمہ اللہ تعالیٰ ورقاۃ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ دعائیکہ از تہ دل برخیزد حزر جاں عزیز باد۔ امید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔ ہم ۲۶ دسمبر ۸۴ء کو مجلس تاسیسی رابطہ میں شرکت کے لیے حجاز مقدس پہنچے۔ ہمراہ چھوٹے بھانجے محمد واضح سلمہ کے فرزند جعفر مسعود ہیں، مجلس سے فراغت ہوگئی۔ اب ۱۷ جنوری کو ہم براہ ریاض (جہاں دو روز ان شاء اللہ قیام رہے گا) دہلی جائیں گے۔ والا مر بید اللہ تعالیٰ' پاکستان کے پیغام پہنچے کہ یہاں ہوتے ہوئے جائیں، مگر اب جلد واپسی کا تقاضہ ہے۔ حالات کا بھی متقضا ہے کہ براہِ راست جائیں۔

جدہ سے ہمارے میزبان اور وکیل کی طرف سے ہمارا ایک چیک یا ڈرافٹ (۱۰۰۰) روپیہ پاکستانی کا پہنچا ہوگا۔ ہم اس کے ساتھ کوئی خط نہ دے سکے۔ ان دنوں طبیعت بہت خراب تھی۔ صرف پتہ اور نام لکھ کر دے دیا تھا۔ امید ہے کہ اپنے دور افتادہ بھائی کا یہ ناچیز تحفہ قبول کرو گے اور اپنے کام میں لاؤ گے۔

گھر میں سب کو اعلیٰ حسب مراتب سلام دعا کہو۔ رسید سے لکھنؤ یا رائے بریلی کے پتے پر مطلع کرو۔ اس وقت عجلت میں یہ چند سطور لکھ دیں' تمہارے خط کا انتظار رہے گا۔ جس کو ڈاک میں ہم سب سے پہلے پڑھتے ہیں۔

فضل ربی ندوی کے ذریعہ "رسائل الاعلام" کا ایک نسخہ بھیجا تھا' پہنچا ہوگا۔

اس میں ہلالی صاحب کے ایک خط میں تمہارا ذکر اور ہمارے قلم سے تعارفی سطریں ہیں۔ کتاب نہ پہنچی ہو تو کراچی سے منگوالو۔

تمہارا نالائق بھائی

ابوالحسن

(۸)

دائرۃ الشیخ علم اللہ الحسنی

تکیہ کلاں۔رائے بریلی۔۲۲۹۰۰۱ (الہند)

برادر عزیز واعز احمد سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ سخت حیرت اور فکر تھی کہ ہم نے کئی خط لکھے اور تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ڈاک آتی تو سب سے پہلے تمہارے خط کی تلاش ہوتی اور ہر مرتبہ مایوسی، اتنی طویل خاموشی اس سے پہلے کم ہوئی۔۲۳ فروری کو عزیزی سعید کو جو براہ کراچی، لاہور جانے والے تھے ایک دستی خط لکھ کر دیا اور ہم آسام کے لیے روانہ ہوگئے۔وہاں سے واپسی پر آج ۲ مارچ کو جب رائے بریلی پہنچے تو تمہارا مفصل خط ۱۴ فروری کا لکھا ہوا ملا۔تم نے مفصل خط لکھ کر بہت کچھ تلافی کردی۔اللہ تعالیٰ تم کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔تم نے جو تفصیلات لکھی ہیں ان کو پڑھ کر قلب پر اثر ہوا۔ہمیں پہلی مرتبہ یہ باتیں معلوم ہوئیں۔تمہاری کئی باتوں میں وہاں کے خاندان کی شاخ بھی شریک ہے۔معلوم نہیں خاندان کا نسلی تسلسل جو بہت سی موروثی خصوصیات کا حامل تھا۔کب تک قائم رہے گا؟ بعض مرتبہ ڈر معلوم ہونے لگتا ہے اور کئی نامور خاندانوں کی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔پھر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت ورحمت سے مایوسی نہیں۔تم نے جن عزیز افراد کے متعلق لکھا ہے ان کے لیے ان شاء اللہ دعا بھی کریں گے۔عزیز محمد سلمہ اور ان کی بہن کو ہدایت کردو کہ ''یا مصور'' کی تین تسبیح پڑھ لیا کریں۔تم نے ہمارے حقیر ہدیہ پر اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان پر تعجب ہوا۔تمہیں اندازہ نہیں کہ ہمیں تم سے کیا تعلق ہے۔افسوس ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہم کوئی خدمت نہیں کرسکتے۔حجاز جاتے ہیں تو تھوڑا سا موقعہ مل جاتا ہے۔تم اس کے بارے میں ادنیٰ تردد سے کام نہ لینا۔اب تو بڑی تمنا تمہارے ایک مرتبہ یہاں آنے کی ہے۔جس دن تم خدا کے حکم اور

فضل سے آ ؤ گے وہ ہم سب لوگوں کی انتہائی مسرت کا دن ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ معلوم کر کے کچھ امید پیدا ہوئی کہ تم پاسپورٹ بنوا رہے ہو۔ رمضان سے پہلے اور شدید گرمی سے پہلے آنا جانا ہو جاتا تو بہت اچھا تھا لیکن آنے سے پہلے اس کا ضرور اطمینان کر لینا کہ ہم کسی سفر پر تو نہیں گئے ہوئے ہیں۔

ظفر علی قریشی صاحب کو ہم نے کل ذرا لکھا ہے۔ ہم نے ان کے بارے میں پورا نوٹ تیار کر کے جس میں گھڑیوں کا بھی ذکر تھا جامعۃ الدمام کے وائس چانسلر صاحب کو بھجوا دیا تھا۔ جن کی دعوت پر ہم ریاض گئے تھے۔ اب وہ عربی میں دوبارہ نوٹ بھیجیں اور استاد عبدالحلیم عدیس کو بھی خط لکھیں۔ ڈاکٹر عبداللہ ترکی صاحب ان کا خاص خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے ظفر علی صاحب کو ایک رقم بھی بھیجی ہے۔

طویل سفر سے آنے کے بعد ڈاک کا ایک انبار تھا۔ اس لیے زیادہ تفصیل سے تم کو نہیں لکھ سکتا۔ برادر عزیز سید ابراہیم سلمہ کا بھی خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ یوسف سلمہ کی شادی گویا گھر ہی میں ہوئی۔ پاکستان میں اس بارے میں بڑا توسع ہو گیا ہے اس لیے میں نے پوچھا تھا ان کو ہمارا سلام اور مبارک باد پہنچا دینا۔ سعید سلمہ پہنچے ہوں گے۔ ان کے کام اور قیام میں مدد کر دینا۔ وہ مولانا سید جعفر علی صاحب کے خاندان کے ہیں۔ جو حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص رفقاء اور خلفاء میں تھے اور جن کی کتاب ''منظورۃ السعداء'' کو تم نے فوٹو کرا کے بھیجا تھا۔ گھر میں سب کو سلام و دعا کہو۔

تمہارا بھائی

ابوالحسن علی

۲ مارچ ۱۹۸۵ء

(۹)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ، الہند

۲ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ

برادر عزیز واعز احمد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکات۔ اللہ کرے تم ہر طرح سے بعافیت ہو۔ ہماری طبیعت ۱۸/۱۹ رمضان المبارک سے خراب ہے۔ آخر کے تین روزے چھوڑنا پڑے اور ضعف کی وجہ سے عید کی نماز میں بھی نہ جا سکے۔ حال آں کہ ہمارے بنگلہ اور تکیہ کی مسجد کا فاصلہ تم کو معلوم ہے۔ اس وقت سے طبیعت ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ خون کی کمی (قصر دم) تجویز کیا گیا ہے۔ اشتہا بالکل مفقود ہے۔ دوا کی طرح کھانا کھاتے ہیں۔ عزیزی مولوی شمس الحق (حامل رقعہ ہذا) سے ملاقات ہوگی تو وہ تفصیل سے حال بتائیں گے۔ بمبئی کے سفر کا خیال ہے۔ وہاں پنچ گنی پہاڑ پر کچھ وقت گزارنے کا منصوبہ ہے۔

ہم نے ایک مفصل اس پر لیٹر ملیشیا سے آنے کے بعد رمضان سے قبل تم کو لکھا تھا۔ اس پر شرمندگی اور افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہماری وجہ سے تمہیں محترمی ظفر علی قریشی صاحب سے شرمندہ ہونا پڑا ہوگا اور ہماری پوزیشن خراب ہوئی ہوگی۔ ان کے خط سے ہم کو غلط فہمی ہوئی کہ کتاب ۹ جلدوں میں ہے۔ ابھی ۲۰ جون کا جو تازہ خط آیا ہوا ہے اس میں انہوں نے تشریح بھی کی ہے کہ ۹ جلدوں کا لفظ میں نے فوٹو کاپیوں کی نسبت سے لکھ دیا تھا۔ اصل مسودے کی دو یا زیادہ سے زیادہ ۳ جلد ہی تیار ہوں گی۔ ہم نے تم کو پہلے خط میں لکھا تھا کہ اچانک معلوم ہوا کہ ہماری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ۶/۷ لاکھ روپے کی مقروض ہے۔ مطبوعات کا اسٹاک بہت جمع ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں ایسی کتاب چھاپنا جو ۹ جلدوں پر ہے (ان کے لکھنے اور اپنے سمجھنے کے مطابق) دشوار معلوم ہوا۔ ہم نے تمہیں لکھا تھا کہ ہمارے پاس پاکستان آنے کی کئی دعوتیں جمع ہوگئی ہیں۔ اسلام آباد کی بھی اور کراچی کی بھی۔ ہمیں شروع اگست میں (اگر خدا

کو منظور ہوا اور صحت ٹھیک رہی) ان شاء اللہ آکسفورڈ بھی جانا ہے۔ ہم یہ سفر پاکستان کے راستہ سے کریں گے۔ وہاں ذمہ داروں اور علم و تحقیق کے قدر دانوں سے مل کر انہیں اس کتاب کی طباعت و اشاعت پر آمادہ کریں گے۔ امید ہے کہ وہیں انتظام ہو جائے۔ رمضان المبارک میں تمہارا ہوائی ڈاک سے لفافہ ملا جس میں ہمارے خط کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ شروع شوال میں ہم نے تم کو ایک کارڈ ہوائی ڈاک سے بھیجا اس کے بھی دو ہفتے ہو گئے آج ۲۰ جون کا لکھا ہوا ظفر علی قریشی صاحب کا خط ملا۔ تم خط یا ٹیلیفون سے ان کو اطلاع کر دینا خط مل گیا۔

پاکستان سے کئی تار بلانے کے آئے، بروہی صاحب کے حوالہ سے بھی ہجرہ اور اسلامک یونیورسٹی کے بھی آئے ہیں۔ لیکن ہم جون میں سفر کرنے کے قابل نہیں اور ۱۵ جولائی تک بھی مشکل ہے۔ اب اگر آنا ہوا تو ۲۰ جولائی تک شاید آنا ہو۔ تمہارے یہاں کی تقریب کب ہے؟ افسوس ہے کہ ہم یہاں سے کچھ خدمت نہیں کر سکتے۔ ایک ادنیٰ چادر اصل لداخ سے آئی ہوئی بھیج رہے ہیں۔ تم اپنے استعمال میں لانا یا سامان میں دینا۔

ایک بات اور دریافت طلب ہے۔ عالم عربی کے مشہور ادیب اہل قلم اور ہمارے قدیم دوست استاد علی طنطاوی نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی کتاب ''تعریف عام بدین الاسلام ہجرء الاول فی العقیدہ'' کا ترجمہ کس نے انگریزی میں تمہاری نگرانی میں کیا ہے اور پاکستان میں شائع ہوا ہے انہوں نے اس کی تصدیق چاہی ہے۔ تم اگر اس کے متعلق کچھ جانتے ہو تو لکھو۔

عزیزی شمس الحق ندوی ہمارے بہت عزیز رفیق کار اور دار العلوم کے استاد ہیں اور ان کے رفیق سفر عزیز ابو سبحان ندوی اسلامک یونیورسٹی کی دعوت پر اسلام آباد جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ تم ان سے مل کر خوش ہو گے اور وہ اپنی سعادت سمجھیں گے۔ تم اس خط کا جواب پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتے پر دو۔ ہم جہاں ہوں گے بھیج دیا جائے گا۔ ہمارے بھانجے بھتیجے سب اچھے ہیں۔ مفصل خیریت و حالات مولوی شمس الحق سے معلوم ہوں گے۔ والسلام

تمہارا بھائی

علی

۲۸ جون ۱۹۷۸ء

خطوط بنام سید حسین حسنی

مولانا علی میاں مرحوم کی حقیقی پھوپھی خاکسار حسین حسنی کی چچی تھیں۔ کیوں کہ وہ انکے چچا پروفیسر حافظ سید طلحہ حسنی مرحوم سابق پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور کی اہلیہ تھیں۔ دوسری طرف مولانا مرحوم کی اہلیہ محترمہ ان کی قریبی بہن تھیں اور یہ رشتہ کچھ یوں تھا کہ مولانا مرحوم کی خوش دامن حسین حسنی کے والدہ کی حقیقی ماموں زاد بہن اور ان کی والدہ کی حقیقی چچازاد بہن تھیں اور یہ خوش دامن مصنف صمصام الاسلام مولانا سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی بڑی صاحبزادی تھیں۔

(۱)

یہ خط میرے بڑے بھائی مرحوم سید حسن حسنی کے نام ان کی اہلیہ کی تعزیت کا ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۹ مارچ ۷۹ء

عزیز القدر حسن میاں سلمہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہیں شاید کسی ذریعے سے معلوم ہوا ہو کہ میں وسط جنوری سے شروع مارچ تک ممالک عربیہ کے دورے پر تھا۔ غالباً جدہ یا مکہ میں عزیزم محمد ثانی سلمہ کے ایک خط سے تمہارے گھر کے حادثے کی اطلاع ملی سخت افسوس ہوا۔ علالت کا سلسلہ تو بہت عرصہ سے چلا آ رہا تھا اور کراچی میں اس کی ایسی کیفیت معلوم ہوئی تھی کہ اس کا اندیشہ تھا لیکن ہندوستان آنے کے بعد

پھر کچھ حال معلوم نہیں ہوا۔ اچانک سفر کی حالت میں یہ خبر ملی خاندانی تعلق اور واقفیت کے بنا پر مجھے اس مرحومہ کی فطری اخلاقی دینی خصوصیات اور ان کی خوبیوں کا علم تھا اور میں جانتا تھا کہ خاندان میں وہ ایک امتیازی خصوصیت کی مالک تھیں اور تمہارے گھر کے لیے باعث زینت و برکت! ہندوستان پہنچا تو عزیزی احمد سلمہ کا مفصل خط ملا۔ انہوں نے بھی ان محاسن وخصوصیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے میں تم سے کن لفظوں میں تعزیت کروں۔ تمہارے گھر کے لیے یہ جیسا سخت سانحہ ہے اس کا خوب اندازہ ہے لیکن حکم خداوندی کو کون ٹال سکتا ہے؟ اور سوائے صبر و رضا کے کیا چارہ ہے۔ تم اہل بیت کے واقعات اور واقعہ کربلا کو یاد کر کے پھر اس سے بھی بڑھ کر وفات نبوی کا خیال کر کے جس سے بڑھ کر کوئی مصیبت دنیا میں نہیں ہو سکی، تسکین حاصل کرو اور اپنے کو راضی برضا بنانے کی کوشش کرو۔ میں سفر میں ایک جگہ نہ رہ سکنے کی وجہ سے پھر پتے اپنے پاس نہ ہونے کی وجہ سے خط نہ لکھ سکا۔ اب محمد ثانی سلمہ سے پتہ لے کر تم کو خط لکھ رہا ہوں اس لیے کچھ تسکین ہوتی ہے کہ میں نے تمہارے یہاں ان کی زندگی میں کھانا کھایا اور ملا اور تمہارے ہی گھر آ سکا۔ یہاں سب کو اس حادثہ پر گہرا تاثر ہے خاص طور پر تمہاری بہنوں کو۔ تم سب کی طرف سے عزیزانہ تعزیت قبول کرو۔ حسین وقاسم' خالد وسعد سلمہم سب کو سلام کہو۔ عثمان میاں کے خط آتے رہتے ہیں۔ ان کو الگ سے خط لکھوں گا۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

(۲)

رائے بریلی

عزیز القدر سید حسین سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

تمہارا ۴۱ فروری کا لکھا ہوا لفافہ اور عزیزی احمد سلمہ کا ۲ فروری کا لکھا ہوا کارڈ ایک ہی ڈاک میں تیسرا چوتھا دن ہے، پہنچا۔ ابھی چند دن ہوئے ان مرحوم (۱) کا تذکرہ اپنی ایک زیر تصنیف کتاب میں کیا تھا۔ اب ان کی تاریخ وفات لکھنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی خوبیاں عطا فرمائی تھیں۔ تہذیب، انسانیت، شرافت کے پتلے تھے اور خاندان کے لیے باعث عزت وفخر! ۷۸ء کے سفر پاکستان میں ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ عزیزوں میں جس نے سنا سن کر افسوس ہوا۔ اہلیہ نے وہی بات کہی جو تم نے خط میں لکھی ہے کہ ہمارے آخری ماموں بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ از راہِ سعادت ان کے گھر جا کر ہماری ہمشیرہ (اہلیہ اسحاق صاحب مرحوم) کو اور لڑکوں کو یہ خط دکھا دینا ہمارے پاس ان کے گھر کا پتہ محفوظ نہیں ہے۔

گھر میں سب کو سلام ودعا کہو۔ یہاں سب تعزیت کرتے ہیں۔

تمہارا

ابوالحسن

۱۹ فروری ۸۲ء

(۴)

ندوۃ العلماء لکھنؤ الہند

۲۳ شعبان ۱۴۱۱ھ

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ تم اور سب اعزہ اور اہل خاندان بعافیت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہمارے اور وہاں کے افراد خاندان کے درمیان ایک رابطہ بنایا، تم ہی سے ضروری حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تم کو خاندان کی خصوصیات کو باقی رکھنے اور ان کی یادگاروں اور کارناموں کی حفاظت واشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

عرصہ ہوا تم نے ''صمصام الاسلام'' کے ان صفحات کے فوٹو اسٹیٹ بھیجنے اور اس پر پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تھی جو وہاں کے نسخے میں متاثر ہو چکے ہیں اور پڑھے نہیں جاتے یہاں سے کسی جز کا ڈاک کے ذریعہ پاکستان بھیجنا مشکل کام ہے اور اس کے پہنچنے کا بھی اطمینان نہیں۔ انتظار تھا کہ کوئی معتبر جانے والا ملجائے تو اس کے ہاتھ بھیجیں۔ عزیزی امتیاز ندوی پاکستان جانے والے تھے، ان کے جانے کا انتظار کیا۔ اب ان کے ہاتھ کتب خانہء ندوۃ العلماء کے نسخے شروع کے پانچ صفحات اور آخر کے بیس صفحات کے فوٹو کاپی اور ایک اچھا پیش لفظ بھیج رہے ہیں۔ امید ہے کہ تم کو پسند آئے گا۔ اس سے کتاب اور مصنف کا اچھا تعارف ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ کتاب وہاں شائع ہو۔ اس کی اشاعت عام ہو اور ان حلقوں میں بھی پہنچے اور پڑھی جائے، جن میں خاص طور پر ایسی ایمان آفرین اور شوق انگیز کتابوں کا پڑھا جانا مفید اور ضروری ہے۔ اس لیے بااثر لوگوں کے ذریعے خاص کوشش کرنی پڑے گی۔ اگر عزیز فضل ربی ندوی اتنی بڑی کتاب چھاپنے سے سردست معذرت کریں تو کسی اور ناشر کو اس پر تیار کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے چاہے سفر کرنا پڑے اور لوگوں کی مدد لینی پڑے، یہ کام

کرنے کا ہے۔ جولوگ اس کام کے لیے مفید ہو سکتے ان سے رابطہ پیدا کر کے (اس سلسلے میں ہمارا بھی حوالہ دے سکتے ہو) اس کام کی تکمیل ہونی چاہیے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت تمہارے حصے میں لکھی اور رکھی ہے کہ ایک بڑا ضروری کام بھی ہو جائے اور اپنے بزرگ کی ایک یادگار بھی محفوظ اور عام ہو۔

تمہارے مطالعہ کے لیے ''کاروانِ زندگی'' کی آخری جلد بھیج رہے ہیں۔ اس میں ۱۹۹۰ء کے آخر تک کے اپنے ملک اور عالم اسلام کے حوادث وواقعات اور ان پر تبصرے بھی آ گئے ہیں۔ امید ہے کہ تم پڑھ کر خوش ہو گے۔ ایک ضروری کام یہ ہے کہ ہماری طرف سے اپنی بہن اور اہلیہ برادرِ محترم حافظ سید اسحاق صاحب مرحوم کی تعزیت ان کے قریبی عزیزوں اور فرزندوں تک پہنچا دو۔ ہمارے پاس کسی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ برادرِ محترم سید عاصم صاحب سے بہت سلام کہو۔ عزیزی آیت اللہ کو بھی بیاض کے متعلق یاد دلاؤ۔ اگر وہ مولوی امتیاز کے حوالے کر دیں تو وہ ان شاء اللہ بحفاظت پہنچ جائے گی۔ تاکید کر دی جائے کہ یہ بڑی نادر اور قابل حفاظت چیز ہے۔ اپنے گھر میں بھی سلام ودعا کہو اور ان چیزوں کی رسید سے مطلع کرو جو بھیجی جا رہی ہیں۔

یہاں بحمد للہ سب خیریت ہے رابع، واضع، حمزہ، عبداللہ سلمھم اور ان کے سب بھائی بخیر و عافیت ہیں۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۱ مارچ ۸۲ء

(۴)

رائے بریلی

عزیز القدر حسین سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آں عزیز کا دستی خط پہنچا۔ تمہاری محبت اور سعادت سے خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ خیر وعافیت سے ملائے الحمدللہ پہلے سے اچھا ہوں لیکن چلنے میں تکلف اور تکلیف ہوتی ہے۔ تمہاری کتاب ''شہید بالاکوٹ'' دیکھنے کا شوق ہے۔ کاش کہ تم نے قاری صاحب کے ہاتھ بھیج دی ہوتی۔ ''ایک اجنبی بالاکوٹ میں'' مضمون کی شکل میں دیکھا تھا اور پسند آیا تھا۔

تم ہمارا یہ خط واپسی پر عزیزی فضل ربی کو دکھا دو وہ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا پورا سیٹ دے دیں گے۔ ہمارے عزیزوں اور اہل خاندان کا وہ بہت احترام کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ پر جو حصہ ہے وہ پڑھ کر خوش ہوں گے۔ آخری دو حصے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب والا۔ یہ خط تم کو لاہور، راولپنڈی سے واپسی پر ملے گا۔ میں چونکہ حجاز جا رہا ہوں۔ اس لیے یہ خط لکھوا دیا۔ ایک مرتبہ یہاں آؤ سارے عزیزوں سے مل جاؤ۔

عزیزی سید عثمان کا بھی خط آیا تھا۔ پتہ محفوظ نہیں تھا۔ ان سے بھی سلام کہہ دینا اور مزاج پرسی کا شکریہ ادا کر دینا۔ ان شاء اللہ حمزہ تک پیغام پہنچا دوں گا۔ گھر میں اور خاندان میں سلام و دعا کہو۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۶۶ اکتوبر ۸۷ء

(۵)

لکھنؤ

عزیز القدر سید حسین حسنی سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم! خدا کرے ہر طرح بخیریت ہو۔ تمہارا ۱۹ دسمبر کا لکھا ہوا خط ہم کو تقریباً ۲۰/۲۵ دن کے بعد بمبئی میں ملا جہاں ہمارا ۲ جنوری سے ۱۸ جنوری تک قیام تھا۔ تم نے ہماری صحت کے متعلق جو کچھ سنا ہے وہ صحیح ہے۔ نقل و حرکت میں تکلیف و تکلف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معذور نہ بنائے۔

تمہارے خط سے بھائی سید عبدالمجید اختر کے انتقال کی اطلاع ملی۔ بڑا افسوس ہوا۔ ہم دونوں ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔ ندی میں ایک ساتھ نہانا' نئی ندی شکار کو جانا' سب یاد ہے۔ آخری بار مکہ معظمہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہمیں ان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں۔ تم ہماری طرف سے اہتمام کے ساتھ ان کے بچوں اور گھر والوں سے تعزیت کرو۔

تمہارا خط حمزہ سلمہ کو ہم دے دیں گے اور ان کو ملامت کریں گے۔ تم بھی اپنے دوست کا بیٹا اور بھتیجا سمجھ کر معاف کر دو۔ مشغول بہت رہتے ہیں، اکیلے ہیں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کی جلدیں تم کو مل گئیں اور تم کو کتاب پسند آئی۔ تمہاری کتاب ''شہید بالاکوٹ'' ہم کو مل جائے گی اور ہم شوق و دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اس وقت تکلیف کی حالت اور شدید مصروفیت ہے رفع انتظار کے لیے یہ چند سطریں لکھوا رہا ہوں۔ اس مختصر خط پر کچھ خیال نہ کرنا۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی

۲۱-۱-۸۸ء

(۶)

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا ۱۲ جون کا لکھا ہوا کارڈ ہم کو سفر سے واپسی پر ۲۱ جون کے بعد رائے بریلی میں ملا۔ اس سے عزیزی سید داؤد کے انتقال کی خبر ملی۔ سب کو افسوس ہوا۔ وہ پھوپھا میاں مرحوم (۱) کی واحد یادگار تھے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اس حادثہ کی اطلاع دی۔ اب تکلیف کر کے ان کی والدہ صاحبہ تک تعزیت کا پیغام پہنچادو۔ حمزہ سلمہ بھی یہیں تھے انہوں نے بھی تمہارا خط دیکھ لیا۔

آئندہ خط لکھو تو خاص خاص عزیزوں کی خیریت ضرور لکھ دیا کرو۔ عرصہ سے احمد کی خیریت بھی نہیں معلوم ہوئی۔ ہم نے انہیں دنوں خط لکھا ہے۔ اپنے بھائیوں اور ہمارے عزیزوں سے سلام کہو۔ والسلام

دعا گو ابوالحسن علی

۲۷ جون ۱۹۸۸ء

از رائے بریلی۔ تکیہ

(۱) پروفیسر حافظ سید طلحہ حسنی مرحوم

(۷)

۲۶-۱-۸۹ء

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ

آں عزیز کا ۱۲ فروری کا خط اور کتاب ایسے وقت ملی کہ میں ایک سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ خط کا جواب تو نہیں دے سکا لیکن کتاب کے مطالعہ کا موقعہ مل گیا اور پڑھ کر خوشی ہوئی۔ طباعت کی کچھ اہم غلطیاں رہ گئی ہیں۔ نظر ثانی کر کے دوسری اشاعت کو صحیح کر دینا کتاب پڑھ کر محمد ثانی حسنی لائبریری رائے بریلی کو دے دی تا کہ اور لوگ پڑھ لیں۔

تمہاری سعادت اور محبت کا شکریہ!

ڈاک بڑی مشکل سے پہنچتی ہے اور بہت دیر لگتی ہے۔ تمہارے خط سے کئی عزیزوں کے انتقال کی اطلاع ملی۔ ہو سکے تو ہماری طرف سے تعزیت کر دینا ہمیں وہاں کے دعوت نامے ملے تھے لیکن پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے معذرت کرنا پڑی۔ زندگی ہے تو آنا ہوگا مگر تم لوگوں نے آنے کا تو ارادہ ہی نہیں کیا۔

عزیزی سعید سلمہ کے دل کی تکلیف کی اطلاع سے تردد ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کلی عطا فرمائے۔ ہماری بہن سے دعا اور مزاج پرسی کر لینا۔ تمہارا خط حمزہ سلمہ کو دکھا دیا جائے گا۔

والسلام

ابوالحسن

بقلم ندیم

(۸)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ الہند

عزیز القدر حسین سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ

آں عزیز کا ۲۲ دسمبر کا لکھا ہوا سعادت نامہ ملا۔ برادر عزیز احمد کے انتقال کی اطلاع ابراہیم سلمہ کے تار سے مل گئی تھی۔ ۱۶ دسمبر کو ان کا انتقال ہوا اور ۱۵ دسمبر کو ہماری اہلیہ (جو تمہاری خالہ زاد بہن تھیں) کا انتقال ہوا جس کی اطلاع تم کو خط لکھنے تک نہیں مل سکی ہوگی۔ معلوم ہوا کہ روزنامہ جنگ میں شائع ہوئی اور اس کی بنیاد پر پاکستان کے چار سربراہ اشخاص کے جن میں حکیم سعید صاحب بھی ہیں، تعزیتی تار آئے۔ اعزہ اور اہل خاندان کو اب معلوم ہوا ہوگا اور شاید ان کے تعزیتی خط آتے ہوں گے۔ احمد مرحوم پر ہمارا ایک مفصل مضمون رسالہ ''تعمیر حیات'' میں شائع رہا ہے۔ خدا کرے وہ تمہاری نظر سے گزرے۔ ان کے یہاں نہ آنے کی حسرت مدتوں رہے گی۔ تم سب لوگوں نے یہاں کا آنا اتنا مشکل سمجھ لیا ہے جتنا دوسروں نے نہیں سمجھا۔ لوگ برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ قاری رشید صاحب ہر سال اپنے پورے خاندان کو لے کر آتے ہیں انہیں کے ہاتھ یہ خط بھجوا رہے ہیں۔

حکیم محمد سعید کے نام خط لکھ کر اسی لفافہ میں رکھا جا رہا ہے ان کو تم خود جا کر دینا ہمارے پاس اس وقت ان کا پورا پتہ نہیں ہے۔ سب سے سلام و دعا کہو اور یہاں سب خیریت ہے۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۱-جنوری ۱۹۹۰ء

(۹)

رائے بریلی

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آں عزیز کا سعادت نامہ مورخہ ۱۳ اکتوبر کو مل گیا تھا لیکن کچھ تو علالت اور مصروفیت اور کچھ پریشانی تھی۔ حالات نے جواب کی مہلت نہ دی۔ اس کا بھی انتظار رہا کہ کوئی جانے والا مل جائے تو اُس کے ہاتھ دستی بھیج دیں۔ ڈاک کے خطوط بہت دیر سے ملتے ہیں۔ مجبوراً یہ کارڈ لکھا جا رہا ہے تا کہ تم کو اطمینان ہو۔

تمہاری کتاب ''صاحب السیف والقلم'' ملی اور پسند آئی۔ اب وہاں خاندان میں تمہیں صاحب قلم رہ گئے ہو۔ خدا صاحب السیف والقلم بنائے۔ تمہارے دوسرے مضامین بھی پہنچے۔ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کو بچوں کے لیے مختصر اور سلیس طور پر لکھ سکتے ہو۔ اگر مولانا عبدالرشید نعمانی اور کسی صاحب علم کی نظر پڑ جائے تو اور اچھا ہے۔

افسوس ہے کہ ''ہمدرد'' میں تمہیں کام نہیں مل سکا۔ حکیم صاحب کا خط تو بہت شریفانہ آیا تھا معلوم نہیں کیوں کام نہیں ہوا؟

عزیزی سید عباس مرحوم (۱) کے انتقال پر جس کی اطلاع تمہارے خط سے ہی ملی۔ تم اور سب اہل خاندان دلی تعزیت قبول کرو۔ کبھی یہاں آنے کی کوشش کرو۔ عزیزوں سے مل جاؤ۔ باقی یہاں سب اچھے ہیں۔ سب کو سلام۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی

۶-۱۱-۱۹۹۰ء

(۱) میرے چچازاد بھائی

(۱۰)

ندوۃ العلماء لکھنؤ الہند

۳ر رجب المرجب ۱۴۱۱ھ

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آں عزیز کا ۱۹ دسمبر ۱۹۹۰ء کا لکھا ہوا کارڈ تقریباً وسط جنوری میں پہنچا۔ قاری رشید الحسن صاحب واپس ہونے والے تھے۔ اس لیے ڈاک کے بجائے انہیں کے ذریعے بھیجنا مناسب معلوم ہوا کہ پاکستان کے خطوط بہت تاخیر سے آتے اور پہنچتے ہیں۔

تم نے عزیزی عباس حسنی کی ہماری طرف سے تعزیت اعزا کو پہنچادی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ معلوم نہیں مرحوم کے کتنے بچے اور بچیاں ہیں؟ عاصم بھائی کی خیریت بہت عرصہ سے معلوم نہیں ہوئی۔ معلوم ہوا تھا کہ حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ اب اعزا بھی ایک خواب ہو کر رہ گئے۔ یہاں کے حالات کی ابھی تک چول نہیں بیٹھی۔ جگہ جگہ فسادات اور واقعات ہو رہے ہیں۔ لکھنؤ بھی اس سے نہ بچ سکا۔ قاری صاحب سے تفصیل معلوم ہوگی۔ کتاب کا نام ''روشنی کے مینار'' زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری محنت قبول فرمائے۔

ایک ضروری بات تم کو لکھنی ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے یہ ضروری اور مفید کام کرائے۔ ہمارے خاندان کے قابل فخر فرد و بزرگ منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی جو تمہارے والد مرحوم کے ماموں اور تمہاری والدہ محترمہ کے چچا ہوتے تھے، کی کتاب ''صمصام الاسلام'' (منظوم ترجمہ فتوح الشام واقدی) ایک بڑا دینی، دعوتی اور مجاہدانہ کارنامہ بلکہ شاہنامہ اسلام ہے۔ صرف ہمارے ہی گھروں میں نہیں بہت سے دین داروں اور علماء کے خاندانوں میں پڑھا جاتا تھا اور جس سے جذبہ جہاد اور شوق شہادت پیدا ہوتا تھا۔ جس میں اب بڑی کمی آ گئی ہے۔ اگر جنرل صاحب حیات ہوتے تو ہم ان سے کہتے۔ اس کو چھپوا کر فوج میں اور پبلک

میں عام کیا جائے۔ حالات کے تقاضے سے بھی اور خاندانی تعلق کے تقاضے سے بھی تم لوگوں پر فرض ہے کہ پاکستان کے کسی ناشر کو اس پر تیار کر کے اس کو وہاں چھپواؤ اور اس کو رواج دو۔ امید ہے کہ وہاں خاندان کے کسی گھر میں اس کا نسخہ مل جائے گا نہ ملے تو اس کو یہاں سے فوٹو اسٹیٹ کر کے بھیجنے کی کوشش کی جائے گی لیکن یہ کام ضرور ہونا چاہیے شاید یہ سعادت تمہارے ہی حصے میں لکھی ہو۔ دوسرے افراد خاندان کو بھی اس کی طرف متوجہ کرو۔ ایمان کے بعد مسلمان کی اصل طاقت یہی ہے اور اس وقت پاکستان کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ ہندوستان میں بھی ان شاء اللہ اس کی کوشش کی جائے گی۔

عزیزوں سے سلام کہو۔ خاص طور پر عزیزی آیت اللہ سے کہو۔ کبھی تو خط لکھ دیا کریں۔ دوسرے یہ کہ اپنے جد امجد سید عبدالجلیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیاض محفوظ طریقے میں بھیجنے کی کوشش کریں۔ ان کا سارا کتب خانہ ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں محفوظ ہے وہ بھی محفوظ کر دی جائے گی لیکن کسی معتبر آنے والے کے ہاتھ بھیجیں۔ گھر میں سلام و دعا کہو۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی

۲۱-جنوری ۹۱ء

(۱۱)

لکھنؤ

۲۷-شوال ۱۴۱۱ھ

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تمہارا خط مورخہ ۲۳ اپریل دستی پہنچا کل ۱۱ مئی کو عزیزی جمیل رائے بریلی سے لکھنؤ آ کر ملے۔ مزید تفصیل معلوم ہوئی۔ ہم نے صمصام الاسلام کے مطلوبہ صفحات کا دوبارہ فوٹو حاصل کر لیا لیکن وہ اتنی دیر میں جا چکے تھے اب یہ اوراق ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ اگر کوئی جانے والا مل گیا تو اس کے ہاتھ ورنہ ڈاک سے بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔ جو صورت بھی مناسب اور قابل عمل ہو اس کتاب کا وہاں چھپنا بہت مفید اور ضروری ہے ہم نے مقدمہ اور تعارف کے طور پر جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی اس کتاب کی اہمیت اور ضرورت سامنے آئے گی۔ عزیزی فضل ربی سلمہ اگر آ گئے ہوں تو ان سے گفتگو مکمل کر لینا۔ خدا کرے اس کے جلد چھپنے کی نوبت آ جائے۔

تمہاری زیر طبع کتاب ''سرگزشت'' کا اشتیاق رہے گا۔ افسوس ہے کہ جمیل زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ورنہ اوراق اور خط انہیں کے ہاتھ بھیج دیتے۔ معلوم نہیں اختر صاحب نے کس کتاب پر کام کیا ہے۔ ہم ۳-۴ دن بعد دو ہفتے کے لیے سفر پر چلے جائیں گے۔

تمہارے اطمینان کے لیے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ امید ہے سب اعزہ بخیر و عافی ہوں گے۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۳-مئی ۹۱ء

(۱۲)

لکھنؤ

عزیز القدر سلمہ اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آں عزیز کا ۲۳ نومبر کو خط ملا۔ عزیزی فضل ربی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ہم نے تمہارے خط کے مضمون کا ذکر کیا۔ وہ کچھ متفکر معلوم ہوتے تھے۔ شاید نشر واشاعت کے سلسلے میں ان کے پاس کافی وسائل نہیں ہیں۔ تم خود ان سے گفتگو کرلو۔ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا اختصار اگر ضروری معلومات اور خصوصیات پر مشتمل ہو اور موثر ہو تو حرج نہیں۔

خدا کرے تمہارے گھر میں آرام ہو اور آنکھ کا آپریشن ہر طرح سے کامیاب ہو۔ سب سے سلام ودعا کہو۔

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۹-دسمبر ۹۱ء

(۱۳)

لکھنؤ

۱۴-محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

عزیز القدر حسین حسنی سلمہ اللہ تعالیٰ ورقاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج ۱۶ جولائی کو علالت وضعف اور مصروفیت کی حالت میں آں عزیز کا ۶ جولائی کا لکھا ہوا خط ملا۔ خاندانی نسبت اور آں عزیز کی محبت وسعادت مندی کے بنا پر خوشی ہوئی۔ کچھ عرصہ ہوا کسی نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ صمصام الاسلام پاکستان میں چھپ رہی ہے اور اس کا کچھ حصہ زبانی پڑھ کر بھی سنایا۔ ہم اس کی تصدیق چاہتے تھے۔ موقع نہیں ملا۔ اب یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ کتاب کی فوٹو کاپیاں تیار ہوگئی ہیں۔ ان کاپیوں کی مدد سے پوری کتاب ہمارے پیش لفظ کے ساتھ چھپنی چاہیے۔ یہ ملت کی اور اس ملک کی بڑی خدمت ہوگی۔ ہمارا یہ خط عزیزی مولوی فضل ربی ندوی کو خود لے جا کر دکھاؤ۔ انہوں نے خط وکتابت بھی بند کر رکھی ہے۔ عرصہ سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس وقت ہم ضعف وعلالت اور بعض ضروری کاموں کی وجہ سے اتنے مشغول ہیں کہ علیحدہ خط لکھنا مشکل ہے، جو بھی اس کتاب کو شائع کرے گا وہ بڑا اجر پائے گا اور وقت کا اہم تقاضا پورا کرے گا۔ کتابت کا بار بھی ان پر نہیں پڑے گا اور پروف ریڈنگ کی زحمت بھی برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔ ہمارا یہ خط تمہارے اور ان کے درمیان مشترک سمجھا جائے گا۔ وہ یا تم ٹیلیفون پر بات کرنا چاہو تو ہم ابھی لکھنؤ میں ہیں۔ ٹیلیفون نمبر یہ ہے 73864 تم سے یا فضل ربی سے بات کر کے خوشی بھی ہوگی۔

تمہاری بھیجی ہوئی کتاب ہمیں نہیں ملی۔ ہمیں اس کا نام اور موضوع بھی معلوم نہیں۔ دوبارہ بھیجنے کی کوشش کرو اور کبھی آؤ تو عزیزوں سے مل جاؤ۔ موجودہ تکیہ اور وہاں کی ترقیات و سہولتوں کو دیکھ کر خوش ہوگے۔ جس گھر میں تم لوگ رہتے تھے وہ معہد الامام سید احمد شہیدؒ کے نام

دینی تعلیم اور حفظہ کا ایک اچھا مدرسہ ہو گیا ہے۔ پختہ سڑک، ڈاک خانہ، بجلی سب آ گئی ہے۔ اپنے سب بھائیوں اور قریبی عزیزوں سے سلام دعا کہو۔ بہت عجلت اور abnormal حالت میں یہ خط لکھا جا رہا ہے، معاف کرنا اور ہماری صحت کے لیے دعا کرنا۔ رابع سلمہ اور سب بخیر و عافیت ہیں، بڑی بھیجتی اہلیہ سید مسلم حسنی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ صحت کے لیے دعا کرنا۔ تمہاری کتاب ابھی تک نہیں ملی پھر بھجوانے کی کوشش کرو۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۶-جولائی ۹۲ء

(۱۴)

رائے بریلی

۵-۳-۱۴۱۳ھ

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آں عزیز کا مکتوب عزیز مورخہ ۱۳-اگست آج ۳ ستمبر کو ایک مہینہ کی مدت میں ملا۔ دونوں ملکوں کی ڈاک کا یہی حال ہے۔ آں عزیز کی دونوں بھیجی ہوئی کتابیں مل گئی ہیں۔ ہم نے یہاں دوسرے عزیزوں کو بھی پڑھنے کے لیے دیں۔ رابع اور مسلم وغیرہ نے بھی دیکھا۔ آج کل احمد علی بھی یہیں ہیں۔ خاندان میں کچھ علالتیں چل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے یہاں کے بیماروں کو بھی اور یہاں کے بیماروں کو بھی شفا عطا فرمائے

ہمیں تمہاری رائے سے اتفاق ہے کہ کتاب پوری چھپنی چاہیے۔ کتاب کی طاقت اور اثر میں فرق پڑ جائے گا۔ اگر اقتباسات چھاپنے ہوں تو اس کے لیے بڑے صاحب نظر اور صاحب ذوق کی ضرورت ہوگی۔ جس کا ملنا آسان نہیں۔ البتہ عارضی طور پر اب کیا جا سکتا ہے۔ شاید کراچی یونیورسٹی کے محبی ابوالخیر کشفی صاحب یہ کام کر سکیں۔ اس وقت عجلت میں اتنا ہی لکھا جا چکا ہے۔ ۳-۴ دن کے بعد ان شاء اللہ ایک طویل غیر ملکی سفر ہے۔ رابع سلمہ بھی ساتھ جائیں گے۔ کتابیں غالباً ان صاحب نے پہنچا دیں جو نیپال کے مدرسہ کے لیے چندہ وصول کرنے وہاں گئے تھے۔

قریبی عزیزوں سے حسب مراتب سلام و دعا کہو۔ اللہ تعالیٰ قریبی زمانے میں خیریت سے ملائے۔ فقط

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۴ ستمبر ۹۲ء

(۱۵)

رائے بریلی

۲۱-۳-۱۴۱۶ھ

عزیز القدر حسین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آں عزیز کا خط مورخہ ۳ اگست کل ۱۸ اگست کو رائے بریلی میں عزیزی احمد علی کے ذریعہ ملا۔ جس سے آں عزیز(۱) کے انتقال کے افسوس ناک خبر ملی۔ اس سے پہلے آں عزیز کے چچازاد بھائی حمزہ کے انتقال کی برادر عزیز ابراہیم سلمہ اللہ تعالیٰ کے خطوط سے اطلاع ملی تھی۔ آں عزیز اور سب برادران واعزہ دونوں کے حادثہ پر تعزیت قبول کریں۔ افسوس ہے کہ دونوں ملکوں میں اتنی دوری پیدا ہوگئی ہے کہ خطوط بھی بہت تاخیر سے ملتے ہیں۔ معلوم نہیں ہمارا خط تم کو کب ملے؟ ملاقات کو بہت جی چاہتا ہے ہم خود بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ چند قدم بھی چلنا مشکل ہے۔

یکم اگست کو لندن کا سفر طے تھا۔ سیٹیں بھی دہلی سے بک ہوگئی تھیں۔ ہم کو اور رابع سلمہ کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے جلسہ میں شرکت کرنی تھی جس کے لیے ہر سال جایا کرتے ہیں مگر ضعف وعلالت کی وجہ سے سفر ملتوی کرنا پڑا۔ اگر کوئی طویل بیرونی سفر ہوتا تو اس کا امکان تھا کہ کراچی سے واپسی ہوتی۔ مگر خود وہاں امن وامان کی حالت اچھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام اعزہ اور تمام شہریوں کی حفاظت فرمائے۔ ہمارا خط برادر عزیز ابراہیم کو بھی دکھا دینا۔ ہم ان کی ملاقات کے بھی مشتاق ہیں کاش کہ برادر عزیز اسحاق بھی آ جاتے تو تسلی ہوتی۔ سب بھائیوں کو اور اپنے گھر میں سلام ودعا کہو! اللہ تعالیٰ سب کو خیریت وعافیت سے رکھے۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۹ اگست ۹۶ء

۱- میرے چھوٹے بھائی سعید حسنی

(۱۶)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۵-۳-۱۴۲۰ھ

عزیز القدر سید حسین حسنی سلمہ اللہ تعالیٰ وعافاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے خیر وعافیت سے ہوں گے۔ عرصہ کے بعد کسی عزیز کا ایسا تعلق ومحبت کا خط ملا جس سے بڑی خوشی ہوئی۔ تم لوگوں کی برابر یاد رہتی ہے اور ذکر ہوتا رہتا ہے۔

ہماری طبیعت ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ مگر الحمدللہ پہلے سے بہتر ہے اور معالجین بھی اطمینان دلاتے ہیں۔ دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔ موقع ہو تو یہاں کا سفر کرو تمہارا آنا ہمارے لیے باعث عزت ہوگا اور ہمیں تقویت ملے گی۔ تمہارے داماد اور بیٹی کے حج پر جانے سے خوشی اور عزت حاصل ہوئی۔ انہیں ہمارا سلام کہو اور گھر میں بھی سب کو سلام پہنچاؤ۔

قاری صاحب کا فون آتا رہتا ہے جس سے خیریت مل جایا کرتی ہے یہاں الحمدللہ سب خیریت ہے۔ مسلم، ابوبکر اور عزیزان رابع وواضح سلام کہتے ہیں۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

بقلم محمود حسن حسنی

کاتب الحروف محمود (نواسہ مولانا سید محمد ثانی) سلام عرض کرتا ہے اور درخواست دعا کرتا ہے۔

(۱۷)

ندوۃ العلماء لکھنؤ الہند

۲۱-۳-۱۴۲۰ھ

عزیز القدر سید حسین حسنی اطال اللہ بقائہ وبارک فیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آں عزیز کا سعادت نامہ مورخہ ۱۶ جون دستی پہنچا۔ پڑھ کر ایسی خوشی ہوئی جیسی اپنے گھر کے ایک فرد اور فرزند عزیز کے خط سے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ کتاب بھی پہنچی۔ بہت اچھے موضوع پر قلم اٹھایا۔ ہم تو بہت علیل اور صاحب فراش ہیں۔ اس پر ان شاء اللہ اچھا تبصرہ ''تعمیر حیات'' میں شائع ہو جائے گا۔ جن خطوط کا آں عزیز نے تذکرہ کیا ہے وہ ہمیں یاد نہیں۔ کب آئے تھے؟ وہ خطوط ہم کو نہیں ملے۔ ہم پتہ چلائیں گے۔

خدا اہلیہ کو شفا عطا فرمائے۔ اہل خاندان میں سے جو بھی قریب ہوں سلام کہیے۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۷- جولائی ۱۹۹۹ء(۱)

۱- میرے نام مولانا کا یہ آخری خط ہے۔

خطوط

(سید حسین حسنی بنام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(۱)

۵-اے، ۱۴/۷-ناظم آباد

کراچی-۱۸

۱۹-دسمبر ۸۷ء

محترم علی بھیا السلام علیکم!

قاری صاحب آ گئے۔ امید کے خلاف انہوں نے کوئی خط نہیں دیا۔ حمزہ کے خط کی بڑی امید تھی۔ افسوس ہوا۔ آپ کی صحت کے بارے میں سن کر فکر اور تشویش ہوئی۔ خدا کرے آپ بالکل صحت مند ہو جائیں اور حسب معمول اپنے مشاغل انجام دینے لگیں۔ معلوم ہوا ہے مسجد جانے میں آپ کو زحمت ہوتی ہے تو آپ وھیل چیئر پر بیٹھ کر جاتے ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو اور آپ خود اپنے پاؤں پر مسجد جانے آنے کے قابل ہو جائیں۔ آمین!

نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ مطلع کرتے ہیں کہ آپ سب کے ساتھی ہمارے ماموں زاد بھائی اختر بھیا (سید عبدالمجید اختر حسنی صاحب) ایک طویل علالت کے بعد ۲۹ نومبر ۸۷ء کو ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ ان للہ وانا الیہ راجعون۔ دونوں نے (اپنے بھائی مرحوم اور اختر بھیا) اب تو مرحوم نے پروگرام بنایا تھا کہ ایک چکر لگا آئیں مگر خدا کو منظور نہ ہوا۔ تمام اعزہ کو مطلع کر دیں۔ خاص طور پر اسماعیل بھائی مسلم بھیا وغیرہم کو اطلاع دینے میں تاخیر ہوئی آج کل پر ٹلتی رہی۔ خیال ہوا کہ عامر بھیا نے مطلع کر دیا ہوگا مگر انہوں نے اطلاع نہیں

دی۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ ان کے انتقال سے تکیہ کی زندگی کا نقشہ ذہن کی سطح پر ابھر آیا۔ ایک ایک بات یاد آتی رہی۔ ماضی کے وہ نقش و نگار بھلائے نہیں جا سکتے۔

لاہور سے آنے کے بعد آپ کا خط مل گیا تھا۔ اس وقت فضل ربی صاحب کے پاس گئے اور مطلوبہ کتاب کی چھیوں جلدیں لے آئے، پہلی پڑھ ڈالی، دوسری پڑھی ہوئی تھی، تیسری ختم کر کے اب چوتھی یعنی حضرت مجدد الف ثانی پر پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے تاریخ اسلام میں بی اے کیا تھا۔ اسی وقت یہ نظریہ قائم ہو گیا کہ ہماری دو تاریخیں ہیں۔ ایک تاریخ اسلام اور دوسری مسلمانوں کی تاریخ۔ آپ کی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت تاریخ اسلام ہے۔ شاہ معین الدین ندوی صاحب کی ''تاریخ اسلام'' مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ یہ فرق کرنا پڑے گا کوئی اس نظریہ کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ کتاب کے اس ہدیہ کے لیے انتہائی شکر گزار ہوں۔

حمزہ اگر خطوط کے جواب نہ دیں تو ہمارے نزدیک وہ سخت ''نالائق'' ٹھہریں۔ آپ نے اپنے کارڈ میں بھی لکھا تھا کہ انہی ہدایت کی جائے گی مگر قاری صاحب کی آمد سے امید ختم ہو گئی۔ انہوں نے کسی صاحب کے کہنے پر ہماری کتاب ''شہید بالاکوٹ'' ہندوستان میں چھاپنے کی اجازت کے لیے خط تحریر تو کیا مگر جواب طلب امور کا کوئی حوالہ نہ دیا جس کا بہت ہی افسوس ہوا۔ یہی لکھنا پڑتا ہے انہوں نے صرف مطلب کی بات لکھی اور ہمارا کوئی خیال نہیں کیا۔ انہیں ہماری اور ان کے والد مرحوم کی دوستی کا مطلق احساس نہیں۔ اگر احساس ہوتا تو جواب طلب امور کے جواب ضرور دیتے۔ افسوس صد افسوس!

انہوں نے بڑی نالائقی کی کہ ہم نے جو کتابیں (شہید بالاکوٹ) آپ کو اور مولانا محمد یوسف کو بھیجی تھیں وہ بھی نہ پہنچائیں۔ کیونکہ آپ کے خط سے پہلے ہی اظہار ہوتا ہے آپ نے تحریر کیا ہے کہ ''قاری صاحب کے ہاتھ ایک نسخہ بھجوا دیا ہوتا'' کیا معنی رکھتا ہے قاری صاحب نے آ کر بتایا کہ مولانا محمد یوسف کو کن کا نسخہ ابھی تک انہیں کے پاس رکھا ہے کیونکہ ان کا پتہ

انہیں معلوم نہیں۔ حالانکہ ان کی کتاب کے ساتھ ایک خط بھی منسلک تھا۔ اس میں پورا پتہ لکھا ہوا تھا۔ کتابوں کے ساتھ جو خط حمزہ کو لکھا تھا اس میں انہیں ہدایات تھیں کہ اسی پتہ پر کتاب روانہ کر دی جائے اور رسید سے مطلع کیا جائے۔ افسوس! ہماری بڑی بدقسمتی ہوگی اگر حمزہ نے یہی رویہ رکھا تو شاید خط و کتابت کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں لکھنا پڑھنا آتا ہی نہیں یا سخت غیر ذمہ دار ہیں۔

امتیاز صاحب بھی بڑے وعدے کر کے گئے تھے مگر انہوں نے بھی کوئی خط نہیں لکھا۔ انہیں تین کتابیں دی تھیں ایک محمد ثانی حسنی میموریل لائبریری کے لیے، دوسری مولانا مرتضیٰ کے لیے، تیسری ان کو۔ پتہ نہیں مولانا مرضیٰ کو کتاب پہنچی یا نہیں۔ مولانا کی طرف سے بھی کوئی رسید نہیں آئی۔ پتہ نہیں لوگوں میں غیر ذمہ داری، احساس بے تعلقی یا ''بھول'' کیوں پیدا ہوگئی ہے۔

مولانا یوسف کوکن کا پتہ مندرجہ ذیل ہے۔

نمبر ۶ - میلاپوران اسٹریٹ - مدراس-۱۴ 6-Maylapioran Street, Madras-14

آپ ہی کسی کو ہدایت کریں کہ وہ حمزہ سے کتاب لے کر مندرجہ بالا پتہ پر مولانا صاحب کو بھیج دے اور وہ صاحب اگر مندرجہ ذیل باتوں کے جواب بھی دے سکیں تو دیں۔ کیونکہ حمزہ سے تو

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۱۔ محمد ثانی مرحوم کے خطوط جو ہمارے نام تھے انہوں نے کیا کیے؟

۲۔ آپ کے خطوط انہوں نے کیا کیے۔ ان کی رسید؟

۳۔ ''شہید بالاکوٹ'' کون صاحب چھاپ رہے ہیں؟ ان کا پتہ؟

۴۔ اپنا نسب نامہ بھیجا تھا۔ اس کا کیا کیا، رسید؟

۵- مولانا مرتضیٰ صاحب کو کتاب ملی یا نہیں؟

۶- مئی ۸۴ء میں جب آپ تشریف لائے تھے تو آپ کے ساتھ واضح تھے انہیں تحریکات ملی پر ''مجلّہ علم وآگہی'' دیا تھا۔ اس میں پہلا مضمون ہمارا ہی تھا۔ تحریک اصلاح و جہاد یعنی یہ مضمون تقریباً ہندوستان کی دوسو سال کی اسلامی تاریخ پر مشتمل تھا یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود حسن تک۔ واضح کو بتا دیا تھا کہ آپ کو دکھا دیں، انہوں نے شاید نہیں دکھایا۔

قاری صاحب نے محمد ثانی مرحوم کے لیے تعزیتی خط کی کاپی دی۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں، یہاں سب آپ کے لیے اور آپ کی صحت مندی کے لیے دعا گو ہیں۔ سب اعزہ اور پرستانِ حال کو سلام۔ والسلام

آپ کا
حسین

(۲)

۵-اے ۱۴/۷ ناظم آباد

کراچی-۱۸

۱۲ فروری ۸۸ء

محترم ومکرم علی بھیا! السلام علیکم

خدا کرے یہ خط اور کتاب آپ کو صحت مند پائیں۔ آپ کا کارڈ اور بعد میں حمزہ سلمہ کا لفافہ ملے۔ خیریت اور حقیقت حال معلوم ہوئی۔ آپ کی صحت کی طرف سے فکر اور تشویش ہے جن حضرات کو بتایا گیا وہ بھی آپ کی صحت کی طرف سے فکر مند ہیں اور صحت کلی کے لیے دعا گو ہیں۔

حمزہ کے خط سے صورت حال کا علم ہوا۔ حالانکہ جیسے ہی کتاب چھپ کر آئی تھی، پہلی فرصت میں چار نسخے ایک آپ کے نام، دوسرا حمزہ کے لیے، تیسرا مولانا محمد یوسف کوکن (مدارس) اور چوتھا خدا بخش لائبریری پٹنہ کے لیے قاری سید رشید الحسن صاحب کو دے دیے تھے، تاکہ وہ کسی کے ہاتھ پہنچا دیں۔ قاری صاحب نے بعد میں بتایا بھی کہ کتابیں پہنچ گئیں۔ اس لیے اطمینان ہو گیا تھا مگر رسید نہ آئی اور اسی طرح تقریباً ایک سال گزر گیا۔

ہوا یہ کہ جو صاحب کتابیں لے گئے تھے انہوں نے آپ کا نسخہ اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کا نسخہ چرا لیا۔ حمزہ کے نام خط جس میں ہدایات تھیں وہ ضائع کر دیا۔ صرف دو نسخے حمزہ کا اور مولانا یوسف کوکن کا حمزہ کو دیا خدا انہیں بخشے اور غریق رحمت کرے۔ ان صاحب کے لیے اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے شدید تذبذب میں مبتلا کر دیا اور شدید بدگمانی اور غلط فہمی ہوئی۔

لہٰذا دوبارہ آپ کو رجسٹرڈ پوسٹ ایک نسخہ ''شہید بالاکوٹ'' ارسال کر رہے ہیں، اس میں اس خط کی فوٹو کاپی بھی منسلک ہے۔ اصل خط علیحدہ لفافہ میں روانہ کر رہے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی ملے مطلع کیجیے گا۔

اگر کتاب نہ ملے تو دوبارہ کسی کے ہاتھ روانہ کر دیں گے۔ آپ حمزہ کا نسخہ دیکھ سکتے ہیں۔ قاری صاحب واپس آئے تو بھی انہوں نے تفصیل سے کچھ نہ بتایا۔ لہٰذا مزید بے چینی اور بے مزگی ہوئی۔ حمزہ کی کوتاہ قلمی سے بھی بڑی غلط فہمی ہوئی اگر حمزہ رسید لکھ دیتے تو ضرور کچھ نہ کچھ علم ہوتا۔

اختر بھیا مرحوم کے گھر جا کر آپ کی طرف سے تعزیت کر دی تھی اور خط بھی لکھ دیا تھا۔ خاص طور پر ان کی ہمشیرہ منی آپا کو۔ وہ اور ان کے بیٹے سعید آپ کو سلام کرتے ہیں اور مزاج پرسی کرتے ہیں اور صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ یہ بھی اطلاع دیتے ہیں۔ اس عرصے میں ہمارے بھتیجے سید عبدالرحمٰن سچے میاں پسر سید حبیب الرحمٰن و عائشہ بی اور سید مصطفیٰ صاحب پکھئی (نصیر آبادی) بھی وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سچے میاں کے بعد اب حبیب میاں اور عائشہ بی کا کوئی فرزند باقی نہ رہا۔ محترمہ ننھی آپا کو بتا دیجیے ان کے قریب ترین بھانجے تھے۔

تاریخ دعوت و عزیمت کی پہلی، تیسری، چوتھی اور پانچویں جلدیں ختم کر ڈالیں۔ دوسری اور آخری پڑھی ہوئی ہیں۔

مشرف علی صاحب کے بھانجے نے بتایا کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آپ کی دعا کے طالب ہیں۔ خدا کرے وہ جلد اچھے ہو جائیں۔ آج جمعہ ہے مگر ہم لوگ کرفیو میں بند بیٹھے ہیں۔ صرف نماز کے لیے وقفہ ہوا تھا۔ خدا اپنا رحم فرمائے اور ہم لوگوں کے گناہ معاف فرمائے۔ آمین! سعید ہمارے چھوٹے بھائی کو بھی دل کی تکلیف، انجائنا کی شکایت ہو گئی آج کل آرام کر رہے ہیں۔ ۱۵ دن ہسپتال میں رہ کر آئے ہیں۔ ویسے سب اچھے ہیں۔ ہماری بیوی سلام عرض کرتی ہیں۔ والسلام

آپ کا
حسین

(۳)

بی-۴۷، بلاک ڈی
نارتھ ناظم آباد، کراچی ۳۳
۳-اگست ۹۲ء
محترم ومکرم علی بھیا السلام علیکم!

آپ کا ۱۶ جولائی ۹۲ء کا ایروگرام ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ آپ کی صحت کی طرف سے تشویش اور فکرمندی ہوئی۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحت مند رکھے اور ہم سب عزیزوں کے سروں پر آپ کا سایہ ہمیشہ قائم رکھے۔ مسلم بھیا کی اہلیہ کی صحت کی طرف سے بھی فکرمندی ہے۔ آپ کے خط سے قبل احمد علی کا خط بھی آیا تھا، انہوں نے اپنی ساس کی صحت کی خرابی کا تذکرہ کیا تھا۔ خدا سے دعا ہے کہ انہیں صحت کلی عطا فرمائے آمین! ہماری بیوی کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی، ان کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے دوا علاج جاری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم چلتے پھرتے رہتے ہیں۔

آپ کا خط فضل ربی صاحب کو دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ پوری کتاب شائع کرنے میں تقریباً ۳۰ ہزار تک کا خرچہ آجائے گا اور ضروری بھی نہیں کہ ساری کتابیں بک جائیں۔ کیونکہ کتاب سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب کے کچھ اقتباسات تقریباً ۱۰۰ صفحات تک آپ کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیے جاسکتے اور اگر مانگ ہوئی تو پھر پوری کتاب شائع کر دی جاسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقتباسات کا انتخاب کون کرے؟

ڈاکٹر یونس دوسرے اصحاب کی اور میری بھی یہ رائے ہے کہ کتاب پوری شائع ہو ورنہ ساری محنت بیکار جائے گی۔

ہم نے انہیں صمصام الاسلام کو نصف سائز میں شائع کرنے کی ترغیب دی، نصف سائز

ہونے سے اس کا پڑھنا بھی آسان ہو جائے گا۔ اس کے کچھ صفحات نصف سائز پر فوٹو کاپی کرا کر دیکھے بالکل صاف پڑھنے میں آتا ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو کہ اقتباسات ہی شائع ہو جائیں تو پھر کسی سے ان اقتباسات کا انتخاب کرا کر بھجوا دیں۔ انتخاب کے لیے فوٹو کاپی کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ ان صفحات کی صرف نشان دہی کر دی جائے جن کا انتخاب کیا گیا ہے کہ فلاں صفحے سے فلاح صفحے تک۔ یہاں جو کتاب اب بالکل صحیح حالت میں ہے وہ فضل ربی صاحب کو دے دی جائے گی۔ تا کہ وہ فوٹو کاپی کرا لیں اور پھر شائع کریں۔

ہماری اپنی رائے یہی ہے کہ پوری کتاب شائع ہو اور یہ دلیل بالکل بودی ہے اور قابل قبول نہیں کہ کتاب سے کوئی واقف نہیں ہے۔ لہٰذا کتاب [illegible] سکے گی۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس زمانے میں جب دو مرتبہ شائع ہوگئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی تو اب کیوں نہ لی جائے گی۔ اس کی شہرت اور دلچسپی کے لیے آپ کا دیباچہ بہت کافی ہے اور پھر جیسا کہ آپ نے لکھا کہ جو بھی اس کتاب کو شائع کرے گا وہ بڑا اجر پائے گا اور وقت کا اہم تقاضا پورا کرے گا۔ انہیں آپ کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ اس سودے میں گھاٹا بالکل نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ اجر اور ثواب کا منافع بھی حاصل ہوگا۔ نصف سائز پر نہایت مناسب اشاعت ہو سکتی ہے اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ لاگت بھی بہت کم ہو جائے گی۔ یعنی شاید بیس ہزار۔

اپنی کتاب ''کراچی سے خیبر تک'' بھیج رہے ہیں اور اس کے ساتھ ایک اور کتاب جو ہم نے ہی تالیف کی ہے اور اس کی ہمدرد فاؤنڈیشن نے شائع کیا ہے یعنی ''امت کی مائیں'' اس میں بڑی محنت اور احتیاط کرنا پڑی۔ ایک خاص کام کیا ہے یعنی تاریخ پیدائش، تاریخ نکاح، تاریخ وفات کو ہر ممکن طریقہ سے صحیح لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اب کوئی غلطی ہو تو نشان دہی پر دوسرے ایڈیشن میں دور کی جا سکتی ہے۔ کتابوں کی رسید سے مطلع فرمائیں۔ رسید تو حمزہ بھی لکھ سکتے ہیں آج کے اخبار میں رائے بریلی میں کسی مسجد میں بم پھٹنے کی اطلاع کے ساتھ دو بچوں

کی ہلاکت کی اطلاع ملی ہے۔ خدا اپنا رحم فرمائے۔ آمین۔

کتابیں نہ ملنے کا بڑا افسوس ہوا۔ جن صاحب نے بددیانتی کی ہے خدا ان سے سمجھے۔ حالانکہ وہ نیپال سے مدرسوں کے لیے چندہ وصول کرنے آتے ہیں۔ بھلا ایسے شخص سے رقم کے معاملے میں دیانت کی امید کی جاسکتی ہے، انہیں کے ساتھ محمد ثانی حسنی میموریل سوسائٹی کے لیے ایک بڑا چندہ بھی بھیجا تھا کیونکہ اب کی ارشاد صاحب نہیں آئے تھے۔ شاید انہیں صاحب نے ''شہید بالاکوٹ'' بھی غائب کردیں۔

طالب دعا

آپ کا

حسین حسنی

(۴)

۵-اے،۱۴-۷-ناظم آباد، کراچی ۱۸

۱۳-مارچ ۹۲ء

محترم ومکرم علی بھیا! السلام علیکم

بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ یقین کرنے کو جی چاہتا مگر یقین کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ موت برحق ہے اور اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ پیشگی جب کوئی اطلاع نہ ہو تو پھر بات ''ہارٹ فیل'' پر ٹالی جاتی ہے اور صبر کرنا پڑتا ہے محمد میاں مرحوم کے لیے بھی ہارٹ فیل ہی سمجھ کر صبر کر لیا گیا مگر بعد میں تفصیلات سے پتہ چلا کہ انہیں اپنڈکس ہو گیا تھا۔

محمد ثانی مرحوم کو مرحوم لکھنے کو دل نہیں چاہتا مگر لکھنا پڑ رہا ہے ان کے لیے بھی تفصیلات آئیں تو معلوم ہوا کہ انہیں کتے نے بھنبھوڑ لیا تھا۔ کاش ہم ہوتے تو انہیں زبردستی ہسپتال لے جاتے اور اینٹی ریبک (Anti Rabic) انجکشن ضرور ضرور لگواتے۔ وہ کتنا ہی نہ نہ کرتے مگر ہم انہیں ضرور ہسپتال لے جاتے۔ مگر ہاں وقت موعود نہیں ٹالا جا سکتا۔

اس سانحہ پر ۳۶ء میں سعد مرحوم کا سانحہ بہت یاد آیا جو احساس غم اس موقع پر ہم دونوں کو ہوا تھا وہ بڑی شدت سے جاگ اٹھا۔ یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ چاق و چوبند۔ تندرست' ہنستا کھیلتا' لڑتا بھڑتا ہر وقت کا ساتھی' اس طرح آنکھیں بند کر لے گا اور ہم لوگوں کو روتا دھوتا چھوڑ جائے گا۔ جامن کے نیچے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا جائے گا' دل نہیں مانتا تھا۔ مولسری کے نیچے جہاں ہم لوگ ''سکری تلا'' کھیلتے تھے ہم دونوں بیٹھے مرحوم دوست کو یاد کرتے رہے۔ آج بالکل اسی طرح ہم انہیں یاد کرتے ہیں۔ وہی احساس' وہی شدت غم۔

خط لکھنے کو بالکل دل نہیں چاہتا کہ ہم اور محمد ثانی کی تعزیت کا خط لکھیں۔ صبر ہی تو دل کو بہلاتا رہتا ہے آپ کی کتاب پرانے چراغ حصہ اول اور دوم الٹتے پلٹتے' کبھی اچھے ابا کا حال پڑھتے اور کبھی محمد میاں کا۔ آپ کے سینے کے داغوں میں ایک اور داغ کا اضافہ ہوا۔ آپ لکھیں گے اور بہت کچھ لکھیں گے۔ جس طرح اچھے ابا کے لیے لکھا۔ جس طرح محمد میاں کے

لیے لکھا۔

ہم دونوں کی دوستی مثالی دوستی تھی۔ ہمارے بڑے بھائی ہم دونوں کو ''نیکڑے'' کہتے تھے۔ ہم نیکڑوں میں ایک فرق تھا یعنی ایک مسٹر تھا اور ایک مولانا۔ وہ شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا کے خلیفہ تھے مگر ہمارے لیے تو وہ صرف اور صرف محمد ثانی تھے اور ہم ان کے لیے صرف حسین تھے۔

ان سے دور رہنے کے باوجود وہ ہم سے بہت نزدیک تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک قرآنی آیت بتائی تھی کہ جب کوئی چیز گم ہو جائے تو پڑھ لو مل جائے گی۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کھوئی چیز اس آیت کے پڑھنے سے مل گئی۔ مگر ہاں وہ نہیں مل سکے کیونکہ وہ اب ایسی جگہ چلے گئے کہ وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

مولانا نعمت اللہ قادری مرحوم میں، وہ بھی ایک سال ہوا مرحوم ہو گئے، محمد ثانی کی شباہت دیکھتے تھے۔ ویسی ہی طبیعت، ویسی ہی باتیں، ویسا ہی خلوص۔ ہم کہتے محمد ثانی کراچی میں مل گئے مگر خدا کو منظور نہ ہوا وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سارے شہر میں سائیکل پر گھومتے پھرتے تھے۔ کتابوں کی تجارت کرتے تھے، ہم نے کئی مرتبہ منع کیا۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ مگر بے فکر بے پروا۔ انتقال کے دن ان کے بڑے بھائی پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری سے ملنے گئے تو ان کے بھتیجے نے پوچھا کہ چچا میاں کے بارے میں۔ آپ کو کچھ معلوم ہے؟ ہم نے کہا نہیں بتایا کہ ان کا تو انتقال ہو گیا۔ جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ تفصیل معلوم ہوئی، ایک ٹرک کی ٹکر سے زخمی ہوئے اور دو تین دن موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا نعمت اللہ بھی چلے گئے اور محمد ثانی بھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمارا دل تو چاہتا تھا کہ سلمٰی سلمہا کا نکاح محمد ثانی پڑھاتے جو کہ قاری رشید الحسن صاحب کو پڑھانا پڑا۔ ہمارا شادی کا دعوت نامہ تو انہیں مل گیا ہوگا۔ انہوں نے پڑھ بھی لیا ہوگا۔ شاید مبارک باد کا خط لکھنے کا ارادہ بھی کیا ہو مگر موت نے مہلت نہ دی۔

وہ ہم سے ملنے دو مرتبہ ایبٹ آباد آئے اور ایک مرتبہ کراچی ہمارا معمول تھا کہ جب تک وہ رہتے تھے ہم دفتر سے چھٹی لے لیتے تھے اور پھر ہم ہوتے تھے اور وہ۔ بالاکوٹ دو مرتبہ گئے۔ شام ہو رہی تھی پہاڑوں کے ویرانے میں حضرت شاہ اسماعیل شہید کے مزار کے قریب ایک صاف جگہ دیکھ کر ہم سے کہا تم اذان دو گے۔ ہمیں اذان آتی تو تھی مگر کچھ ہچکچاہٹ ہوئی۔ وہ مانے نہیں بہرحال ہم نے اذان دی۔ وہ امام ہوئے ہم دو مقتدی دوسرے حکیم احسان الٰہی صاحب ہوتی پار کلیانی کے۔ اندھیرا ہو جانے کے بعد ست بنے کا نالا عبور کر کے ہم لوگ قاضی محمد یونس بالاکوٹ کے گھر گئے وہاں کھانا کھایا اور رات بھی وہیں گزاری۔ ان کے ساتھ وہ سفر ہمیشہ یاد رہے گا۔

یہ قلم بھی انہیں کی یادگار ہے جس سے یہ خط لکھ رہے ہیں۔ اس سے ہم نے بی اے کیا' کتابیں لکھیں' مضامین لکھے۔ سید صاحب پر ''اجنبی بالاکوٹ میں'' اور ''حضرت امام ابن تیمیہ صاحب السیف والقلم'' لکھیں۔ اول الذکر اسلامک پبلی کیشنز لاہور چھاپ رہی ہے دوسری بالکل تیار ہے۔ بچوں کے لیے جانوروں کے بارے میں ایک معلوماتی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جو اخبار جہاں میں ۲۲ اقساط میں شائع ہوا۔

طبیعت حاضر کر کے یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ لکھنے کو تو بہت ہے مگر دل نہیں چاہتا۔ ہو سکتا ہے بعد میں اتنا لکھوں کہ کوئی کتاب بن جائے۔

یہ خط سب کے لیے ہے' بوا کے لیے' خدیجہ کے لیے' حمزہ اور امامہ کے لیے بھی۔ کل من علیھما فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔ والسلام

آپ کا
حسین

(۵)

۶ جولائی ۹۲ء

محترم علی بھیا! السلام علیکم

امید ہے آپ اور دیگر اعزہ بخیریت ہوں گے۔کل احمد علی کا خط آیا، خیریت معلوم ہوئی' ساتھ ہی اس بات کا افسوس ہوا کہ ہماری کتاب جو فضل ربی صاحب نے چھاپی تھی نہ تو آپ کو ملی نہ احمد کو اور نہ ہی حمزہ کو۔ کیونکہ احمد نے کتاب کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔عید کے فوراً بعد ہی قاری رشید الحسن صاحب نے کسی صاحب کو دیں تھیں کہ پہنچادیں۔مگر وہ آپ لوگوں تک نہیں پہنچی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صمصام الاسلام کے لیے عرض ہے کہ اس کی نہایت اعلیٰ درجہ کی صاف ستھری فوٹو کاپیاں تیار ہوگئی ہیں۔فضل ربی صاحب کے پاس آپ کا نوٹ بھی موجود ہے۔اس کی اصل ہمارے پاس محفوظ ہے۔سلمان سلمہ کی موجودگی میں طے ہوا تھا کہ اس کے کچھ اقتباسات آپ کے نوٹ کے ساتھ شائع کیے جائیں مگر ہماری ڈاکٹر یونس حسنی اور دیگر اعزہ کی رائے ہے کہ پوری کتاب شائع ہو۔ورنہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور ساری محنت بے کار ہو جائے گی۔

آسان اور کم خرچ طریقہ یہ ہوگا کہ اس کے تھوڑے کم سائز کی مائکروفوٹو کاپیاں تیار کی جائیں گی۔لاگت فی صفحہ تقریباً ایک یا ڈیڑھ روپیہ آئے گی۔اس طرح کتاب کی رقم بچ جائے گی اور پروف ریڈنگ کی زحمت سے بھی نجات مل جائے گی۔یہی آپ کی خواہش ہے اور ہم سب اعزاہ کی بھی کہ یہ کتاب دوبارہ شائع ہو اور موجودہ نسل پڑھے اور جوش و جذبہ حاصل کرے۔آپ فضل ربی صاحب کو لکھ دیجیے کہ کتاب کی فوٹو کاپی ہم سے منگالیں۔ان کو ہمارا ٹیلیفون نمبر معلوم ہے۔ خدا کا شکر ہے گھر میں دو ٹیلیفون ہیں' جن کے نمبر یہ ہیں۔ 6637303-6630583 ان کا آدمی بھی ہمارا گھر جانتا ہے۔

اس خط کی رسید سے مطلع فرمائیں۔ کتاب دوبارہ کسی محفوظ ذریعے سے بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری بیوی بھی آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہیں۔ ہم دونوں دعاؤں کے طالب ہیں۔ والسلام

آپ کا

حسین

خطوط بنام قاری سید رشید الحسن

قاری سید رشید الحسن کی خوش دامن مولانا علی میاں کی حقیقی خالہ زاد بہن تھیں۔ سید رشید الحسن صاحب دوسری طرف نواب صدیق حسن خان صاحب کے پر پوتے ہوتے ہیں یعنی سید نجم الحسن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ نجم الحسن صاحب کے والد بزرگوار نواب الحسن صاحب اور حکیم سید عبدالحئی صاحب آپس میں پیر بھائی بھی تھے کیونکہ دونوں حضرات حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔

قاری رشید الحسن صاحب جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی کے خطیب ہیں۔

(۱)

۱۲-۵-۱۹۸۳ء

عزیز القدر رشید میاں سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ اس سے پہلے جو دستی خط اور کتاب 'تحفہ دکن' بھیجی تھی۔ وہ پہنچ گئی ہوگی۔ آج ایک اور جانے والے مل گئے۔ ان کے ہاتھ بھائی جمیل صاحب کے نام خط اور آپ کے نام یہ پرچہ لکھ کر حوالے کر رہا ہوں۔ خدا کرے آپ کا خط بھی آتا ہو۔

بھائی جمیل صاحب کے رسائل اور کاغذات پہلے پہنچ گئے تھے۔ خط بعد میں پہنچا۔ اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔

اور کوئی نئی بات اس وقت نہیں۔ ندوہ' رائے بریلی میں الحمدللہ خیریت ہے۔ گھر پر سب کو سلام و دعا۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی

(۲)

عزیز گرامی قدر قاری صاحب عفا اللہ واطال اللہ بقائہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ خط بڑی ندامت اور معذرت کے ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ ایک دن اچانک عزیزی ابراہیم کا کویت سے ٹیلیفون آیا کہ قاری صاحب کو پیٹ کی شکایت ہوئی تھی اور وہ ہسپتال میں داخل ہیں۔ اس سے فکر پیدا ہوئی تھی گھر میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ آپریشن کی ضرورت پیش آئی۔ وہ الحمدللہ کامیاب رہا اور آپ بعافیت گھر واپس تشریف لائے۔ ہم برابر پوچھتے رہے کہ کراچی سے کوئی ٹیلیفون آیا؟ حال میں معلوم ہوا کہ ٹیلیفون آیا تھا اور الحمدللہ طبیعت اچھی ہے۔ ہم کچھ تو سفروں پر رہے اور طبیعت بھی اعتدال پر نہیں تھی۔ خیریت دریافت کرنے کے لیے کوئی خط نہیں لکھ سکے۔ شاید آپ کو احساس ہو اس لیے ایسی حالت میں کہ آج ہی دہلی اور وہاں سے ۲۷ اگست کو لندن کے لیے روانگی ہے۔ سفر کی تیاری کی سخت مصروفیت ہے لیکن یہ چند سطریں عجلت میں لکھی جا رہی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ ہم آپ کے دادا صاحب اور ان کے اہل تعلق کو ایصال ثواب نہ کرتے ہوں۔ افسوس ہے کہ شاید مصروفیت اور ہمت کی کمزوری کی وجہ سے خط و کتابت کی ہدایت نہیں آئی مگر الحمدللہ تعلق اور فکر میں کوئی کمی نہیں ہے۔ گھر میں سب کو سلام و دعا۔ یہاں لکھنو رائے بریلی میں سب خیریت ہے۔ اہلیہ صہیب سلمہ بھی خیریت سے ہیں۔ شروع میں ہم نے احتیاطاً آپ کی علالت کی اطلاع نہیں دی مگر بعد میں ان کو براہِ راست معلوم ہوا۔ واپسی ان شاءاللہ ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں ہوگی۔ عزیزی رابع سلمہ اس سفر میں ساتھ ہیں۔ انگلستان سے مراکش اور وہاں سے حجاز مقدس جانے کا پروگرام ہے والغیب عنداللہ ''پرانے چراغ'' کا تیسرا حصہ بھیجا تھا جس میں برادر محترم سید جمیل صاحب کا تذکرہ تھا۔ امید ہے کہ آپ نے عزیزی ابراہیم کو دے دیا ہوگا اور عزیز احمد الحسنی مرحوم کا بھی تذکرہ ہے۔ برادرم ابراہیم کو بھی بھجوایا تھا۔ معلوم نہیں کہ پہنچا کہ نہیں؟

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

بقلم عبدالحلیم ندوی

(۳)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ الہند

۲۵ رجب ۱۴۰۸ھ

عزیز القدر قاری سید رشید الحسن صاحب سلمہ

السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا ۹ رجب کا لکھا ہوا خط برادر عزیز سید محمد ابراہیم کا خط کے ساتھ ۲۲-۲۳ رجب کو اس وقت ملا جب میں تقریباً تین ہفتہ کے بعد سفر سے واپس ہوا۔ بھائی سید محمد جمیل صاحب کے انتقال کی خبر عزیزوں کے انتقال کی خبر آپ کے خط سے معلوم ہوئی۔ ہم نے ابراہیم صاحب سے بڑی شکایت کی کہ انہوں نے اتنی تاخیر سے ہم کو بھائی جمیل صاحب کے انتقال کی خبر دی جو تعلق ہمارے ان کے درمیان تھا اس کا تقاضا تھا کہ ہم کو تار سے اطلاع دی جاتی۔

عزیزی طاہر سلمہ کا خط اس سے پہلے آیا تھا لیکن اس کے بعد ہی سفر پر روانہ ہو گئے۔ دہلی، اندور اور بمبئی کا سفر رہا۔ ہماری صحت کا حال یکساں ہے۔ چلنے میں تکلیف اور تکلف ہوتا ہے۔ پاکستان سے کئی دعوت نامے آئے تھے۔ سب سے معذرت کرنی پڑی۔ ۱۷ کو حکیم سعید کے یہاں جلسہ تھا۔ ہمارے نام کی پبلسٹی ہو گئی تھی لیکن ان سے بھی معذرت کرنی پڑی۔ ابھی کچھ اندازہ نہیں کہ وہاں کا سفر کب ہو سکے گا۔ مولانا ناظم صاحب سے پچھلے سفر میں فون پر گفتگو ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت دے۔

اس وقت بہت عجلت ہے۔ گھر میں سب کو سلام و دعا کہیں۔ ہمشیرہ صاحبہ کی طبیعت الحمدللہ پہلے سے بہتر ہے۔ والسلام

ابوالحسن علی

راقم نذر الاسلام ندوی

(۴)

ندوۃ العلماء لکھنؤ الہند

۱۹ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ

عزیز گرامی قدر قاری صاحب بارک اللہ فی حیاتہ ودرجاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ مع افراد خاندان عزیز بخیر وعافیت ہوں گے

عزیزی سلمان سلمہ مولوی شمس الحق وامتیاز وغیرہ کراچی گئے۔ ان سے بھی خیریت معلوم ہوئی۔ آپ کا براہ راست کوئی خط نہیں آیا لیکن برخورداران طاہر وصفیہ سلمہا کے سعادت نامے ملے۔ افسوس ہے کہ وہ خطوط رائے بریلی میں رہ گئے۔ اپنی یاد سے لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا تعلیمی حال اور ہماری کتابوں کے پڑھنے کا ذکر کیا ہے اور عمرے پر جانے اور ہم لوگوں کو دعا وغیرہ میں شریک کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمشیرہ صاحبہ کو بھی بہت خوشی ہوئی۔ ہم بھی ان کی سعادت سے بہت خوش ہوئے۔ اب بہت کم خط لکھتے ہیں۔ کبھی کسی آنے جانے والے کو دے دیتے ہیں جو بہت دیر میں پہنچاتا ہے۔ ان بچوں نے ہمارے آنے کے ارادے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ ہمارا ابھی ادھر کا کوئی پروگرام نہیں۔ کسی غیر ملکی دورہ میں امکان ہے کہ آتے جاتے اتر جائیں۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ آپ کو صہیب سلمہ، صدیقہ سلمہا اور نور چشم شعیب کا وہاں پہنچنا اور آپ سے ملنا مبارک ہو۔ خدا کرے پورا سفر خیر وعافیت اور برکت کے ساتھ ہوا ہو۔

گھر میں بہت بہت سلام ودعا کہیے۔ سید حسین سلمہ کے لیے صمصام الاسلام کا سرورق اور ابتدائی صفحات بھیج رہے ہیں۔ جو ذرا واضح اور صاف ہیں کوشش کیجیے گا کہ وہ ان کے ہاتھ میں دے دیے جائیں۔ صہیب سلمہ خود راستوں سے واقف نہیں۔

عبدالرزاق اور نثار الحق کا سلام قبول ہو۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۲ جولائی ۹۱ء

(۵)

لکھنؤ

۱۸ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

۲۷ ستمبر ۹۱ء

عزیز گرامی قدر قاری رشید الحسن صاحب بارک اللہ واعزہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ۲۲ ستمبر کو انگلینڈ اور حجاز مقدس کے سفر سے۔ واپسی ہوئی۔ مکہ معظمہ میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ عزیزی صہیب سلمہ لکھنؤ پہنچ گئے ہیں۔ کل ۲۷ ستمبر کو ملنے آئے اور آپ کا اور صفیہ سلمہا کا خط دیا۔ یقیناً صہیب اور ان کے گھر والوں کے آنے سے آپ سب پر بہت اثر ہوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پھر خیریت سے ملائے۔

آپ نے اپنے کئی خطوط کا ذکر کیا ہے۔ ہمیں یاد نہیں کہ آپ کا ایک کے سوائے کوئی خط ملا ہو۔ ہم نے خط میں لکھا تھا کہ آپ ڈاک سے خط نہیں بھیجتے۔ دستی بھیجتے ہیں وہ اکثر نہیں پہنچتے اور پہنچتے بھی ہیں تو بہت تاخیر سے۔ اگر آپ نے خط لکھے ہوں اور ہم نے جواب نہ دیا ہو تو معاف کیجیے گا۔ اس کا تعلق بے خیالی یا کم تعلق سے نہیں ہے سفر بہت طویل ہو گیا تھا۔ جلد واپسی کی ضرورت تھی۔

دہلی میں 'جنگ' کے ایک نمائندہ ملے تھے۔ وہ اگلے دن ہی کراچی جا رہے تھے۔ ہم نے ان کے ہاتھ نسخہ 'تقویۃ الایمان' کے جدید ایڈیشن کا بھیجا تھا جس میں ہمارے حواشی اور مقدمہ ہے۔ آپ پڑھ کر خوش ہوں گے۔ عزیزی فضل ربی کو بھی ایک نسخہ بھیجا ہے، ان کو فوراً چھپوا لینا چاہیے۔

''کاروان زندگی'' میں آپ کے مشورہ کا تذکرہ کر دیا ہے۔ نئے ایڈیشن میں ان شاء اللہ تلافی کی کوشش کی جائے گی۔

صفیہ سلمہا کو بہت سلام اور ان کے خط پر اظہار مسرت کر دیجیے۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

(۶)

لکھنؤ

۹-۴-۱۴۱۲ھ

عزیز گرامی قدر!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۱۳ اکتوبر کا لکھا ہوا مکتوب ملا۔ خوشی اور اطمینان ہوا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ''تقویۃ الایمان'' کا غلط نامہ تیار کرلیا۔ ہم نے مکتبہ کو دے دیا ہے کہ محفوظ رکھا جائے۔ آئندہ طباعت تصحیح کے بعد نکلے۔ وہاں اس کی طباعت کی خبر سے خوشی ہوئی۔

صہیب مع اہلیہ جے پور میں ہیں اور خیریت سے ہیں۔ ''گل رعنا'' کے مقدمہ کے بارے میں آپ نے متوجہ کیا، اچھا کیا۔ ''کاروان زندگی'' کا چوتھا حصہ جب نکلے گا تو ان شاء اللہ (بہ شرطِ حیات) اضافہ کردیا جائے گا۔

بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا جو آپ نے حال لکھا ہے اس سے مسرت ہوئی۔ آج کل صحت بھی بہت کمزور چل رہی ہے اور پروگرام بہت ہیں۔ اختصار کو معاف کیجیے۔ نثار الحق کا سلام قبول ہو۔ مولانا طاہر صاحب کو آج کل درد کی بہت تکلیف ہے۔

ابھی بھوپال جانا ہوا تھا۔ نواب صاحب کے مقبرہ پر بھی حاضری ہوئی۔ بڑی خوبصورت عمارت بن گئی ہے۔ منسٹر صاحب جنہوں نے اس سے دلچسپی لی، ملنے آئے تھے اس کا بہت ذکر کرتے تھے۔

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

(۷)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ الہند

۵-۶-۱۴۱۲ھ

عزیز گرامی قدر قاری سید رشید الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ وبارک فی اعقابہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ مع اہل خانہ وفرزندان وافراد ہر طرح سے بعافیت ہوں گے۔ یہاں بھی الحمد للہ خیریت ہے۔ معمولی شکایتیں اور تغیراتِ مزاج ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل فرماتا ہے۔ ہماری تکالیف ومعذوریاں البتہ چل رہی ہیں، پھر بھی قریب وبعید کا سفر جاری ہے۔ اب آپ کی آمد کے دن ان شاء اللہ قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ خیرت وعافیت کے ساتھ لائے اور ہم سب سے ملائے۔

یہ خط ایک خاص ضرورت سے لکھ رہے ہیں اور وہ ایسا کام ہے جو بظاہر آپ ہی کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ جعفر بھائی مرحوم کے پاس ان کے پردادا اور ہمارے والد صاحب مرحوم کے رشتہ کے نانا سید عبدالجلیل صاحب مرحوم کی بیاض تھی۔ جس کا ذکر والد صاحب نے ''گل رعنا'' کے مقدمہ میں ان الفاظ میں کیا ہے کہ ''وہ بیاض کیا تھی ایک جام جہان نما تھا۔ اس میں بہت سے اکابر کے سنین وفات اور اہم حوادث وواقعات تھے۔ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے آتے'' یہ بیاض جعفر بھائی مرحوم اپنے ساتھ پاکستان لے گئے۔ ہم نے عزیزی آیت اللہ سلمہ سے بار بار کہا کہ وہ ہمیں دے دو۔ ان کے کتب خانہ محفوظ کتب خانہ دارالعلوم میں محفوظ رہے گی۔ ہمیں کئی چیزیں اس میں دیکھنی ہیں مگر وہ نہ دے سکے۔ خدا کرے محفوظ ہو۔ اب ایک بہت اہم کڑی اس کے ذریعہ سے دریافت کرنی ہے۔ آپ کسی طرح ان کو راضی کر لیں کہ وہ بیاض آپ کو دے دیں اور آپ اس کو لیتے آئیں۔ ان کو اور ان کے بھائی کو جن کا نام سید عقیل ہے آپ اس پر راضی کر لیں۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو آپ اس کو فوٹو کاپی کرا کر لیتے آئیں۔

سب خرچ ہم دے دیں گے۔ پرائیویٹ طریقہ پر یہ بات بھی آپ کو لکھتے ہیں کہ اگر وہ خواہش کریں یا آپ ان کو ضرورت مند سمجھیں تو پانچ سو روپیہ کم وبیش ان کو بھی پیش کر سکتے ہیں۔ یہ بہترین تحفہ ہوگا۔ جو آپ اپنے ساتھ لائیں گے کسی طرح سے خدا کرے یہ کام آپ کے ذریعہ ہو جائے۔ عزیزی فضل ربی سے بھی آپ اس میں مدد لے سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہم کو مایوس نہ کریں گے۔ خدا کرے یہ خط آپ کی روانگی سے پہلے مل جائے۔ گھر میں سب کو سلام دعا اور شوق ملاقات کہیے۔ نثار الحق کا سلام پہنچے۔ والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۲ دسمبر ۹۱ء

(۸)

رائے بریلی

عزیز گرامی قدر قاری صاحب اطال اللہ بقائہ! والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ امید ہے کہ آپ مع تمام افراد خاندان بخیر وعافیت ہوں گے۔ آپ نے خط وکتابت کی، نہ ٹیلیفون سے رابطہ قائم ہوا دونوں کام مشکل تھے۔ مولوی طاہر کے گھر سے معلوم ہوا کہ ٹیلیفون پر خیریت معلوم ہوئی تھی۔ یہاں تو قیامت صغریٰ گزر گئی۔ حالات، اخبارات اور ریڈیو سے معلوم ہوتے رہتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل خاص فرمائے۔ گھر میں سب سے سلام ودعا کیجیے۔ لکھنؤ رائے بریلی میں سب خیریت ہے۔

عثمان بھائی جو سعودی عرب میں کام کرتے ہیں اور وہاں جاتے ہوئے کراچی سے گزریں گے۔ ان کے ہاتھ خط بھیج رہے ہیں۔ ان کے ساتھ احمد حسین دلدار حسین کو تمباکو کے دوڈبے مولانا عبدالجلیل صاحب کے لیے بھیج رہے ہیں۔ آپ یا تو ڈھڈیاں ضلع سرگودھا کسی جانے والے کے ہاتھ بھجوا دیجیے۔ ہم نے ان کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ ڈبے آپ کے یہاں محفوظ ہیں، منگوالیں یا آپ کسی معتبر آدمی کے ہاتھ بھیج دیں۔ ان کو اس کی بہت ضرورت رہتی ہے۔ باقی سب خیریت ہے رمضان بہت اچھا گزرا۔ امید ہے کہ آپ کے یہاں بھی ہر طرح خیر و برکت رہی ہوگی۔ عزیزہ فاطمہ سلمہا اور بچوں بچیوں کو سلام و دعا۔ اگر برادر محترم محمد جمیل صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی ابراہیم سے ملاقات ہو تو ہمارا سلام اور خط نہ لکھنے کی شکایت۔

سلام

دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۳-شوال ۱۴۱۳ھ

(۹)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔الہند

عزیز گرامی قدر قاری سید رشید الحسن صاحب اطال اللہ بقائہ !السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔آپ کا شکایتی خط ملا۔دل پر ایک چوٹ لگی اور اتنی تاخیر جو تعزیتی خط لکھنے میں پیش آئی، ندامت ہوئی۔اول تو یہ ہمیں افسوس ناک اطلاع تاخیر سے ملی۔مولوی طاہر صاحب کے یہاں ہمارا آنا جانا تاخیر سے ہوتا ہے۔پھر ایسے پے در پے حوادث پیش آئے جنہوں نے دل و دماغ کو ایسا متاثر و مشغول کر لیا جو اس سے پہلے یاد نہیں۔چار چار واقعے فریکچر کے چھوٹے سے خاندان اور چار گھروں کی بستی میں پیش آئے۔جن میں سب سے بڑا حادثہ آپا جان (والدہ رابع سلمہ) کا فریکچر کا بڑا حادثہ تھا۔پھر خدیجہ سلمہا (والدہ حمزہ سلمہ) کا پھر حادثہ کی اطلاع سن کر قرآن خوانی اور ایصال ثواب دارالعلوم کے ذریعہ خط لکھ کر کرا دیا تھا۔خط لکھنے میں ایک دقت یہ تھی کہ ہمارے خطوط کے بارے میں گورنر صاحب کی طرف سے سنسر کرنے کی ہدایت جاری ہوئی ہے۔یوں بھی پاکستان جانے والے خطوط بڑی تاخیر سے ملتے ہیں۔مولانا عبدالجلیل صاحب کو خط مکہ معظمہ کے پتہ پر ان کے صاحبزادہ کو بھیجا۔انہوں نے وہاں سے پاکستان بھیجا۔اس خیال میں کہ کوئی جانے والا مل جائے تو دستی بھیج دیں۔اب حسنی صاحب نے اس کا ذمہ لیا ایک اہم مجلس مشاورت (پرسنل بورڈ کی میٹنگ) میں یہ خط لکھا جا رہا ہے۔پھر بھی ہم معافی چاہتے ہیں۔روزانہ بلا ناغہ سورۂ یاسین پڑھ کر آپ کے دادا صاحب، دادی صاحبہ اور والد و چچا کے لیے ایصال ثواب کرتے رہتے ہیں۔لکھنؤ میں داخل ہوتے ہی نواب صاحب مرحوم اور سب مرحومین لکھنؤ کے لیے ایصال ثواب کرتے ہیں۔منزل پڑھ کر آپ کے لیے دعا کرتے ہیں۔آپ کا معافی نامہ آ جائے تو اطمینان ہوگا گھر میں سب افرادِ خاندان کو سلام و دعا۔والسلام

تقصیر و تاخیر
معترف
ابوالحسن علی

(۱۰)

دہلی۔اوکھلا

۱۱-اگست ۹۳ء

امید ہے کہ ان شاء اللہ ۱۹ اگست کو ترکی، انگلستان و امریکہ کا سفر ہوگا۔ واپسی ان شاء اللہ ۱۵-۲۰ ستمبر تک ہوگی۔ ایک ضروری بات رہ گئی۔ ''پرانے چراغ'' کی تیسری جلد زیر طباعت ہے میں برادرِ محترم سید محمد جمیل صاحب سابق (اکاؤنٹنٹ جنرل) کی تاریخ وفات درج کرنی ہے۔ وہ ان کے بھائی ابراہیم صاحب یا دوسرے اعزہ سے معلوم کر کے ہم کو اس سے مطلع کریں۔ انتظار رہے گا۔

ابوالحسن علی

(۱۱)

ندوۃ العلماء۔الہند

عزیز القدر قاری رشید الحسن صاحب اطال بقائہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔امید ہے کہ ہمارا خط جو ہم نے حسینی صاحب کے ہاتھ دہلی سے بھیجا تھا پہنچ گیا ہوگا جس میں ہم نے تعزیت کے خط میں تاخیر کے لیے معذرت کی تھی کہ ہمارے یہاں متعدد حوادث پیش آئے۔ہمشیرہ صاحب کے فریکچر ہو گیا۔والدہ حمزہ سلمہٗ کے فریکچر ہوا۔مولوی طاہر کے..... کا تھا اور حوادث بھی پیش آئے۔اطلاع بھی دیر میں ملی۔

یہ خط استنبول (قسطنطنیہ) سے لکھ رہے ہیں۔یہاں کی مٹھائی کا ایک ڈبہ بچوں کے لیے بھیج رہے ہیں ترکی کا تحفہ اور تبرک بھی ہے۔گھر میں سب سے سلام و دعا کیجیے۔ہم برابر دعا کرتے ہیں۔فرداً فرداً سب سے سلام و دعا کہیے۔آج ہی دو بجے کے بعد لندن جا رہے ہیں وہاں جا کے پھر امریکہ جانا ہے۔شاید عمرہ کر کے ہندوستان واپسی ہو۔صحت ایسی ہی چل رہی ہے۔اللہ خیریت سے پہنچائے اور سب کو زندہ سلامت دکھائے اور ملائے۔والسلام

دعا گو ابوالحسن علی

۲۸-اگست ۹۳ء

ہوٹل سلطان، استنبول (ترکی)

(۱۲)

مدینہ منورہ

شارع ابی ذر۔ بستان نورولی

عزیز القدر قاری صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے سب خیر وعافیت ہوگی۔ شاید آپ کو (اگر مولوی ایوب ابھی نہیں پہنچے) تو یہ تعجب ہو کہ یہ خط مدینہ طیبہ سے لکھا جارہا ہے۔

ہم اس سعودی جہاز سے ۱۸ مارچ کو جدہ پہنچے جس سے بالعموم ہم یہاں آیا کرتے ہیں۔ ۱۶ مارچ کو بمبئی سے آپ کو ٹیلیفون کے ذریعے اپنے پروگرام کی اطلاع دینے کی بہت کوشش کی لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ کراچی کی لائن خراب ہے۔ تار کا وقت نہ تھا اور ہمارا سفر ہمیشہ کی طرح بالکل آخر وقت میں طے ہوتا ہے۔ کراچی جہاز پہنچا اور اس احساس سے تکلیف ہوئی کہ آپ کو کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ہمشیرہ مرحومہ کے انتقال کی وجہ سے اور بھی آپ اور آپ کے گھر والوں سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک خط احتیاطاً مولوی ایوب صاحب کو لکھ کر دے دیا تھا۔ اگر آپ کو ہمارے پروگرام کی اطلاع نہ ہوسکی تو اس خط کے ذریعے حالات معلوم ہوجائیں گے۔ معلوم نہیں وہ پہنچے یا نہیں؟

آپ کی امانت آپ کی ہدایت کے مطابق اپنی اپنی جگہ پہنچادی گئی۔ قمر صاحب کا پتہ بھوپال سے مل گیا تھا۔ ان کو بھی حیدرآباد ان کے پتہ پر ان کی امانت بھجوادی۔ ہمارا آگے کا پروگرام ابھی قطعی نہیں ہے۔ اس کانفرنس میں شرکت کا وعدہ ہے جو لندن میں ۱۳ اپریل سے ہو رہی ہے لیکن اس قدر جلد رخصت ہوجانے پر طبیعت آمادہ نہیں اور بھی بہت سے کام باقی ہیں۔ ۱۶ اپریل سے جدہ میں تعلیمات کی ایک کانفرنس منعقد ہورہی ہے۔ اس میں بھی شرکت کا پرانا وعدہ ہے اس لیے بھی تردد ہے کہ لندن جائیں یا یہ مدت یہیں گزار دیں۔ بہرحال واپسی جب

بھی ہوگی اگر راستہ کراچی کا ہوگا تو ان شاء اللہ آپ کو ضرور مطلع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سفر میں رابع سلمہ ساتھ ہیں۔

عرصہ سے فضل ربی سلمہ کی اشاعتی سرگرمیوں کا حال معلوم نہیں ہوا ''پرانے چراغ'' کے بعد کوئی چیز تیار ہوئی یا نہیں؟ ہم نے ان کو لکھا تھا کہ ''منصب نبوت'' کی اشاعت کو مقدم رکھیں۔ اس کی اس وقت وہاں ضرورت ہے مولوی ایوب کے ساتھ ''زادسفر'' کا ایک مکمل نسخہ بھی بھیجنے کی ہدایت کردی تھی۔ فضل ربی اس کتاب کو بھی شائع کر سکتے ہیں۔ البتہ اس کا حساب الگ رہے گا۔ ''باب کرم'' کا ایک نسخہ اسی لیے ساتھ لائے ہیں کہ آپ کے حوالے کردیں اور آپ اس کی طباعت کا وہاں انتظام کریں تاکہ مرحومہ کی یادگار وہاں بھی زندہ رہے۔

عرصہ سے برادرِ محترم سید محمد جمیل صاحب کی خیریت و مشغولیت کا حال معلوم نہیں ہوا۔ خط کا تو ان کا معمول نہیں ہے۔ ہمارا سلام پہنچا دیجیے۔ مخدومی مولانا محمد یوسف بنوری صاحب کی خدمت میں سلام۔ محمد رابع آپ کو اور آپ کے گھر میں سلام کہتے ہیں۔

راقم ابوالحسن علی

۲۲-۴-۹۶ء

شیخ نذیر حسین، لاہور

ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔الہند
(تکیہ کلاں رائے بریلی)
محب فاضل محترم جناب شیخ نذیر حسین صاحب
مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کا لکھا ہوا مکتوب ڈاک سے ملا۔ چند دن کے بعد عزیزی فضل ربی ندوی انسائیکلوپیڈیا کی مطلوبہ جلدیں جو آپ نے ازراہِ کرم ومحبت رعایتی قیمت پر اپنے نام خرید کر ان کے حوالے کی تھیں، لائے۔ آپ کی اس خصوصی عنایت کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔ میں نے آپ کے (اور) آپ کے رفقاء کی محنتوں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ زندگی رہی تو آئندہ بھی اٹھاتا رہوں گا۔ جلد ۱۸ اور جلد ۱۹ بھی مکمل ہونے پر حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ جلد ۲۰ میں آپ کے مقالات خصوصیت کے ساتھ پڑھوں گا۔ آپ نے اچھا کیا کہ مولوی محمد علی کی اردو تفسیر قرآن ندوہ کے کتب خانے کے لیے بھیج دی۔ میں لکھنؤ جاؤں گا تو دیکھوں گا۔ علامہ طیبی کی شرح مشکوٰۃ کے حوالے کتابوں میں آتے ہیں۔ میں نے بھی ان کی تحقیقات کا حوالہ دیا ہے۔ ان کے اقوال میں خاص وزن محسوس ہوا۔ موقعہ ہوا تو بعض ناشرین سے اس کا ذکر کروں گا۔ کیا آپ کی تحقیق کردہ ابھی تک نہیں چھپی؟ خدا کرے آپ پھر کسی اچھی تقریب سے یہاں آئیں اور کچھ وقت گزاریں۔ امید ہے کہ مزاج ہر طرح بعافیت ہوگا۔ اس سے پہلے آپ کا بھیجا ہوا ایک مقالہ اور بھی علاحدہ سے آیا تھا۔ میں اس کی رسید نہیں دے سکا تھا۔ والسلام

مخلص
ابوالحسن علی
۱۴-۱۲-۸۴ء

علی میاں رحمہ اللہ کا ایک یادگار مکتوب

بنام

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دمشق سے مولانا گیلانی کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا۔ مولانا نے ۲۸ مئی ۱۹۵۶ء کو اس کا مفصل جواب دیا تھا۔ مولانا ندوی مرحوم کے نام مولانا گیلانی کا یہی آخری خط ہے۔ مولانا دمشق سے ترکی تشریف لے گئے قونیہ پہنچ کر ۲۳ جون ۱۹۰۶ء کو مولانا نے انہیں ایک اور خط لکھا۔ جس کے جواب کو وہ منتظر ہی رہے۔ دمشق واپس ہوئے تو انہیں اپنے خط کے جواب کے بجائے مولانا گیلانی کے سانحہء انتقال کی خبر ملی۔ مولانا کو اس حادثے کا شدید قلق ہوا۔ اب مولانا علی الندوی رحمۃ اللہ (ف ۳۱۔ دسمبر ۱۹۹۹ء) کے انتقال کا حادثہ بھی پیش آ چکا ہے۔ حضرت گیلانی کے نام مولانا کا بیش قیمت تاریخی اور علمی معلومات اور افکار سے بھرا یہ خط اس مقام پر درج کر دیا جاتا ہے تاکہ یادگار رہے۔

مولانا دریابادی کے قلم سے اس پر جو نوٹ اور حواشی ہیں انہیں اس طرح برقرار رکھا ہے۔ پہلے یہ نوٹ اور پھر خط مع حواشی کے مطالعہ فرمائیں۔

قونیہ۔ ترکی

۱۴ ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ

ذیل کا مکتوب گرامی، مدیر صدق کے نام نہیں، علامہ گیلانی کے نام تھا۔ آہ! وہ مکتوب جس کی قسمت میں بجائے مکتوب الیہ کے مدیر صدق کو وصول ہونا تھا۔ برائے نام حذف کے بعد بجنسہ درج ذیل ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس نمبر کے دوسرے ضروری مضامین کو عین

وقت پر روک کر اسی کو تمام و کمال شائع کیا جا رہا ہے۔ (صدق)

مخدومی و محترمی زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ گرامی نامہ میرے عریضہ کے جواب میں دمشق میں ملا تھا۔ ان دنوں غیر معمولی مصروفیت تھی۔ اس کے بعد ہی ترکی کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ قونیہ پہنچ کر آپ کو خط لکھنے کا دل پر تقاضا ہوا۔ آپ کے گرامی نامہ کا جواب اور رسید بھی ہو جائے گی اور اس تقاضے کی تکمیل بھی۔

۱۳ جون کو قونیہ سے قسطنطنیہ کے قصد سے روانہ ہوا۔ ریل کا سفر باوجود طوالت کے اختیار کیا۔ تاکہ اس اسلامی سرزمین کو اچھی طرح سے دیکھتا جاؤں۔ طیارے کے سلوک اجمالی کے بجائے ریل گاڑی کے سلوک تفصیلی کو اختیار کیا کہ مجھ جیسے حریص اور ناقص الاستعداد کے لیے یہی مناسب تھا۔ ۴۴ گھنٹے میں یہ سفر طے ہوا۔ ترک ہم سفروں کے طرز عمل اور اکرام سے معلوم ہوا کہ ایمانی ذرات ان کی خاک کے اندر اس طرح ودیعت ہیں کہ کوئی لادینی فتنہ خواہ کمال درجہ کا ہو ان کو نکالنے پر قادر نہیں ہوا۔ ایک ترک عورت نے تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ تمہاری داڑھی اور عمامہ سے ہمارا دل بہت خوش ہوا۔ راستے میں ہزاروں بستیاں گزری ہوں گی شاید کوئی کورہ ایسا ہو جہاں کی مسجد کا بلند مینار اس کی شہادت نہ دیتا ہو کہ یہ مسلمانوں کی بستی ہے۔

استنبول میں ہر سر پر انگریزی ٹوپی دیکھی۔ علماء بھی اس پر مجبور ہیں کہ یا تو ہیٹ پہنیں یا ننگے سر رہیں۔ صرف ائمہ مساجد نماز کے اندر عمامہ باندھ سکتے ہیں۔ لیکن مسجد کے اندر تو صرف یہ معلوم ہونا تھا کہ یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں رہتا اور ترکوں سے بڑھ کر کوئی خاشع و خاضع و مودب نہیں۔ مختلف مسجدوں میں نماز پڑھی ہر جگہ نمازیوں کا ہجوم دیکھا۔ انگریزی ٹوپیاں اتر کر جیبوں سے گول ٹوپیاں نکل آئیں اور معلوم ہوتا کہ کمالی انقلاب اندر نہیں آنے پایا۔

جامع سلیمانی (سلیمان اعظم قانونی کی مسجد) وسیع ترین مسجد ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اندر ۴۰-۵۰ ہزار آدمی آتے ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ رمضان المبارک میں عشاء و تراویح میں

اندر کا حصہ بھرا ہوا ہوتا اور باہر دور تک آدمی ہوتے۔ کل انگورہ میں جمعہ کی نماز پڑھی' عید کی نماز معلوم ہوتی تھی۔ باہر سبزہ پر اور احاطہ میں کاغذ بچھا بچھا کر لوگوں نے نماز پڑھی۔ لوگ ہم کو ایسی ترسی اور حسرت و محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے جو صاف کہتی تھیں کہ اگر ہمارا بس چلے تو ہم یہی اسلامی وضع اختیار کریں' بڑی محبت سے ملتے اور تعلق و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ایک پہلو ہے دوسرا پہلو یہ ہے کہ کمالی انقلاب نے اس صاحب ایمان ملت کا رشتہ اسلام سے' اسلامی قومیت' اسلامی تہذیب و ثقافت سے کاٹنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ صرف یہ ''ترکی کا مریض سخت جان'' تھا کہ ابھی تک مسلمان ہے۔ مجھے پہلے سے اتاترک سے بڑی بدعقیدگی تھی۔ یہاں پہنچ کر جو کچھ دیکھا اس سے تو سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ پھر اکبر کا سادہ حال اور عناد کی کیفیت معلوم ہوئی جو آپ نے حضرت مجدد کے تذکرہ میں بدایونی کے بیانات و معلومات کی روشنی میں لکھی ہے۔ متعدد مساجد اب بھی میوزیم ہیں جن میں نماز قانوناً ممنوع ہے۔ آیا صوفیہ اب بھی آثار قدیمہ کا ایک عجائب خانہ ہے جس میں نماز کی بندش ہے۔ دینی تعلیم بالکل ممنوع تھی۔ جو پارٹی اس وقت برسر حکومت ہے اس کو اس کا اندازہ تھا کہ اگر ترکی کو قدرے مذہبی آزادی اور بعض شعائر کی اجازت دینے کا وعدہ کیا جائے تو وہ انتخاب جیت سکتی ہے۔ چنانچہ اسی کو بنیاد اور انتخاب کا نعرہ بنایا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم نے اس گرم جوشی کے ساتھ تائید کی کہ اس پارٹی کے تقریباً پانچ سو ممبر کامیاب ہوئے اور حکومت کی پارٹی حزب الخلق جو خود کمال کی پارٹی تھی صرف ۳۱ ممبروں کو کامیاب کرا سکی۔ اس کے نتیجہ میں اذان کی عربی میں اجازت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ جب پہلی بار عربی میں اذان ہوئی ہے تو قوم بے خود ہوگئی۔ سڑکوں پر لوگوں نے فرط مسرت سے سجدے کیے اور سیکڑوں' ہزاروں مینڈھے خوشی میں ذبح ہوئے۔ دینی تعلیم کی اجازت ہوئی۔ مسجدوں کے واگزار کرنے کا بھی خیال ہے۔

یہاں اس کا بھی اندازہ ہوا کہ لاطینی رسم الخط کا مسئلہ ایسا سطحی اور جزئی نہیں ہے جیسا بہت سے سطحی النظر لوگ سمجھتے ہیں۔ کسی مسلمان قوم کو اس کے ماضی اور مسلمانوں کی ثقافت اور

دوسرے مسلمانوں سے ذہنی و تعلیمی طور پر جدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ کوئی کارگر حربہ نہیں۔ چند برس کے اس رومن رسم الخط کا نتیجہ یہی ہے کہ ترکی قوم اپنے ماضی اور اسلامی ثقافت اور باہر کی اسلامی دنیا سے تقریباً بیگانہ ہوگئی ہے اور اس نسل کے ختم ہونے کے بعد شاید اتنا بھی تعلق نہ ہو۔ باہر کا آدمی مسجد کے باہر اپنے کو بالکل بیگانہ پاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اسلامی ملک میں نہیں بلکہ یورپ میں ہے۔ اتاترک کی اس دور بینی کی داد دینی چاہیے کہ قوم کو جلد سے جلد اپنے ماضی اور اسلام کی ثقافت سے منقطع کرنے کے لیے اس نے ایسا موثر قدم اٹھایا قوم کا ایک نیا رخ پڑ گیا۔ جو بظاہر اس کو ہر روز اسلام سے دور ہی کرتا چلا جائے گا۔

انگورہ آ کر کچھ مسرت ہوئی۔ حکومت نے جو دینی محکمہ گویا صدارت امور مذہبی قائم کیا ہے وہ مفید کام کر رہا ہے۔ بڑی اور چھوٹی اسلامی کتابیں شائع کرتا ہے جو ہزاروں کی تعداد میں پھیل جاتی ہیں۔ سیرۃ النبی کا ایک ترجمہ دس جلدوں میں ہوا تھا۔ وہ اب نایاب ہے۔ اس کو دوبارہ جدید رسم الخط میں شائع کر رہا ہے۔ خطباتِ مدارس کا ترجمہ بھی تیار ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے اور انگریزی اور اردو کتابوں کے ترجمہ کا مشورہ چاہتے تھے۔ کچھ کتابوں کی فہرست لکھ کر دے دی ہے۔ اچھے مستعد اور فہیم لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی نشاتِ ثانیہ کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ ایسا لٹریچر تیار ہو اور پھیلے جو تعلیم یافتہ اور جدید طبقہ میں جس کے ہاتھ ہمیں ہمیشہ زمام کار ہوتی ہے) دین کی وقعت اور اسلام کی عظمت اور ضرورت کا احساس پیدا کرے اور لادینیت کے اثرات کا ازالہ کرے۔

دوسری چیز جس سے دل خوش ہوا کلیۃ الالٰہیات یا سرکاری مذہبی کالج ہے' اس کے اساتذہ کو علمی و نظری حیثیت سے بہت ممتاز اور لائق پایا۔ اناطولیہ کے شریف مسلمان گھرانوں کے نوجوانوں کا اس کالج کی طرف کافی رجحان ہے۔ دوسری چیز خطباء اور ائمہ مساجد کی تعلیم و تربیت کے مدارس ہیں جو اس وقت ۱۶ کی تعداد میں ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں ہیں۔ ان کے علاوہ دینیات کی تعلیم کے ابتدائی اور ثانوی مدارس ہیں جن کی تعداد بھی بڑھے گی۔ خدا

کرے وہ جماعت برسر اقتدار ہو جو کم سے کم دین سے عناد نہیں رکھتی اور ترکی قوم کے مزاج کو کچلنے کے درپے نہیں۔ یہاں آ کر اس کا احساس اور بڑھ گیا کہ علماء کی ذمہ داری بڑی عظیم الشان ہے۔ دینی صلابت واستقامت کے ساتھ ساتھ بڑے تفقہ' بڑی حکمت اور بڑی بیدار مغزی کی ضرورت ہے۔ خدا ترکی کو ایسے علماء نصیب فرمائے' مجھے تو ہمیشہ اس موقع پر ندوۃ العلماء کی تحریک پر اعتماد اور بڑھ جاتا ہے۔ خدا مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے انہوں نے زمانے کے تقاضوں کا بروقت احساس کیا۔ اگرچہ ان کا خواب پورے طور پر پورا نہیں ہوا مگر اس وقت ترکی کو ایسے ہی علماء کی ضرورت ہے جو قدیم وجدید کے جامع اور کلموا الناس علی قدر عقلوھم پر عامل ہوں۔ افسوس ہے بیماریوں نے آپ کو ایسا معذور کر دیا ہے ورنہ آپ بہت یاد آئے۔ کاش یہاں کے علماء اور کلیۃ الالہیات اور ریاست شئون دینیہ کو آپ سے استفادے کا موقع ملتا۔ اگر آپ کی صحت ذرا اجازت دیتی تو میں درخواست کرتا کہ آپ ترکی کا ایک سفر ضرور فرمائیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ یہاں آتے رہتے ہیں اور لوگ ان سے متاثر اور ان کے مداح ہیں۔ آپ جیسے حضرات کا سفر یہاں کے لیے بہت مفید ہوگا۔

رات قونیہ آیا۔ صبح حضرت مولانا کی زیارت سے مشرف یاب ہوا۔ ستم ظریفوں نے ان کے گرد بھی آثار کا کھڑاک جمع کر دیا ہے۔ اور ان کی قبر مبارک اور مسجد کو عجائب خانہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ بڑی عبرت کا مقام ہے۔ شاید پورے شہر میں ایک بھی ان کے کلام کا سمجھنے والا اور شاید پڑھنے والا بھی نہیں۔ اسی عجائب خانہ کے ایک گوشہ بلکہ ایک حجرہ میں ایک بزرگ نظر آئے جو بالکل تبرک بن گئے ہیں۔ آثار قدیمہ نے ان کو شاید ایک تاریخی یادگار رہی کے طور پر یہاں رہنے کی اجازت دی ہے۔ وہ بے چارے اپنا ایک ہم جنس دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ بار بار مولانا کا ایک شعر پڑھتے رہے۔ میوزیم میں مثنوی کے متعلق فارسی ترکی انگریزی مطبوعات کا ذخیرہ سجایا گیا۔ اس میں قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم کی مراۃ المثنوی کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ میں

نے ناظم آثار کو متوجہ کیا اور پتہ لکھوا دیا۔ وہ پوچھتے تھے کہ ہندوستان میں مولانا کے متعلق کس سے خط و کتابت کی جائے۔ میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کا نام اور پتہ لکھوا دیا۔

ترکی میں قونیہ کا علاقہ اسلامی منطقہ سمجھا جاتا ہے جو اپنی اسلامیت و مشرقیت میں سارے ملک میں ممتاز ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ انفرادیت رکھتا ہے۔

آپ نے اپنے دمشق والے خط میں دریافت کیا تھا کہ اس زمانہ میں شیخ الاسلام (ابن تیمیہ) کے عقیدت مندوں کی تو کافی جماعت ہوگی؟ کیا بے چارے الشیخ الاکبر کی اکبریت کو باقی رکھنے کے لیے بھی کوئی کھڑا کر دیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے ان کی اکبریت کو باقی رکھنے کے لیے ایک بزرگ کو پیدا کر دیا ہے جن کا نام الشیخ احمد الہارون الحجار ہے۔ یہ بزرگ شیخ کے علوم کے اس وقت تنہا حامل ہیں اور ان کو ان سے نسبت صحیحہ معلوم ہوتی ہے۔ شیخ کے نام کے عاشق ان کے علوم کے شارح اور خود صاحب علوم و معارف برائے نام پڑھے ہوئے ہیں بلکہ باقاعدہ بالکل پڑھے ہوئے نہیں۔ مگر علوم مضامین کا ورود اولیاء متقدمین کو یاد دلاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ابن تیمیہ کی عظمت کے بھی قائل ہیں بڑی شفقت فرماتے تھے۔ کاش آپ سے ملاقات ہوتی۔

دائرۃ المعارف کے ناظم ڈاکٹر صاحب کو میں نے توجہ دلائی ہے کہ کم سے کم مولانا کو ان کے دیرینہ تعلق کی بنا پر دائرہ کی جدید مطبوعات کی اطلاع تو ہونی چاہیے۔ نیز نزہۃ الخواطر کی جلد چہارم و پنجم کو بھیجنے کے لیے بھی لکھا ہے۔ اگر نہ پہنچے تو میں لکھنؤ سے ان شاء اللہ بھیجوں گا۔

علامہ بہجۃ البیطار امریکہ میں تھے اب شام آ گئے ہیں۔ کرد علی صاحب دو سال ہوئے ہوں گے انتقال کر گئے۔ میرے زمانہ قیام میں شیخ عبدالقادر المغربی کا بھی انتقال ہو گیا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی خدمت میں یہاں سے مستقل خط لکھنا چاہتا تھا مگر اب وقت نہیں ہے۔ یہ خط آپ دونوں کی خدمت میں مشترک ہے۔ ملاحظہ فرما کر ان کی خدمت میں روانہ فرما دیجیے گا۔ مولانا کی بھیجی ہوئی کتاب اور گرامی نامہ وقت پر مل گئے تھے۔

البتہ ''صدق'' کے پرچے اس وقت تک نہیں پہنچے تھے۔ شاید اب پہنچے ہوں۔ مولانا کے کام کی کوئی کتاب یا کوئی چیز ملی تو ضرور لاؤں گا۔

اس کا جواب اور رسید اب لکھنو کے پتے پر مرحمت ہو۔

اگر اس خط کو پڑھ کر آپ کا کچھ وقت اچھا گزر جائے اور یہ تفریح طبع اور خوشی کا باعث ہو تو اس کا معاوضہ چاہوں گا اور یہ کہ اپنی ہندی کی دو نعتیں لکھوا کر بھجوا دیجیے۔

والسلام مع الاکرام خاکسار ابوالحسن علی

(صدق جدید، لکھنؤ ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء ص ۷-۵)

حواشی

۱- یہ ایک نمونہ ہے۔ ''روشن خیالوں کی رواداری کا۔ تنگ نظری اور لباس و معاشرہ کے معاملے میں تعصب اور تشدد کے لیے بدنام بیچارہ پرانے ملانے ہی ہیں۔ (صدق)

۲- الحمدللہ وماشاءاللہ (صدق)

۳- اللھم انصر من نصر دین محمد واخزل من خزل دین محمد۔ اب یہ بغض فی اللہ رکھنے والے بھی خال خال ہی باقی رہ گئے ہیں۔ (صدق)

۴- یہ اطلاعیں بھی بجائے خود وجد آفریں ہیں۔ (صدق)

۵- پورا پیراگراف بڑا اہم ہے۔ (صدق)

۶- شبلی وسلیمان والی۔ (صدق)

۷- از مولانا سید سلیمان ندویؒ (صدق)

۸- بے شک یہی ہونا چاہیے۔ (صدق)

۹- مکتوب کے یہ فقرے کس درجہ دردانگیز ہیں۔ کاتب کو کیا خبر تھی کہ ہوائی ڈاک سے چلے ہوئے مکتوب کے پہنچنے سے قبل ہی مکتوب الیہ شوق لقائے رب میں سفر جنت کو روانہ ہو جائیں گے۔ (صدق)

۱۰- ایک اطالوی ایڈووکیٹ کی کتاب Traloof Jesus مراد ہے۔ (صدق)

۱۱- علامہ مرحوم کی ایک نعت سوامی دہرمی جی گیلانی والے کے نام سے کہی ہوئی ہندی میں ہے اور ایک ان کے اپنے نام سے اردو و فارسی میں۔ دونوں نعتیں صدق میں ان شاء اللہ گنجائش نکلنے پر شائع ہوں گی۔ (صدق)

ڈاکٹر عبدالعلی، لکھنؤ

بسمہ سبحانہ

برادرِ محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ بمبئی میں آپ کا نوازش نامہ مجھے ملا تھا۔ جس میں آپ نے موسم سرما میں فاطمہ سلمہ کی شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا اور رشتہ کے معاملے میں اپنی پسند اور تائید کا اظہار کیا تھا۔ میں نے آپ کو اس کے جواب میں لکھا تھا کہ موسم سرما تک اس تقریب کو موخر کرنے میں کئی دشواریاں ہیں۔ ان میں ایک یہ کہ اس وقت ہندوستان میں میری موجودگی غیر یقینی ہے کیونکہ باہر کا ایک سفر میرے لیے طے ہے۔ اس کے علاوہ والدہ صاحبہ اپنی پیری اور ضعیفی کی وجہ سے بھی عجلت کی خواہش مند ہیں۔ میں نے آپ کو یہ بھی لکھا تھا کہ آپ ۲۸-۲۹ تک ضرور پہنچ جائیں تاکہ ۳۰ کو یہ تقریب آپ کی سرپرستی میں منعقد ہو اور میں نے سمجھا تھا کہ آپ میری پیش کردہ حتمی دشواریوں کو ضرور محسوس فرمائیں اور ۳۰ کی اس تاریخ سے ضرور اتفاق فرمائیں گے جو عرصہ سے طے چلی آ رہی ہے اور دونوں طرف اس کے پیش نظر انتظامات مکمل کیے جا چکے ہیں۔

بمبئی سے وطن واپسی میں مجھے دیر ہوئی اور میں ۲۹ کی شام تک رائے بریلی پہنچا۔ مجھے امید تھی کہ آپ وہاں اس وقت تک تشریف لا چکے ہوں گے۔ لیکن واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا ایک ایکسپریس خط اور تار آیا ہوا ہے جس میں آپ نے ۳۰ کی تاریخ کے التوا پر زور دیا ہے۔ مزید یہ معلوم ہوا کہ اس خط اور تار کے مضمون سے یہاں بہت برا اثر پڑا اور فاطمہ سلمہا تو برداشت بھی نہ کر سکیں اور ان پر اختلاج کا دورہ پڑ گیا اور دوائیں دینی پڑیں، مزید یہ ہوا کہ

لڑکے والوں کو یہ تجویز بہت ناپسند ہوئی اور انہوں نے اس کو قبول کرنے سے اپنے کو معذور پایا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ لڑکے نواب نجم الحسن صاحب کے صاحبزادے قاری رشید الحسن صاحب سے یہ رشتہ طے پایا ہے ہمارے خاندان سے کس قدر پرانا اور گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ نیز ہمارا خاندان بھی ان کے خاندان سے اسی طرح گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ان لوگوں نے شادی کی تاریخ متعین ہو جانے اور قریب آ جانے کے بعد ان سے ہمارا انکار کر دینا کس قدر برا اثر ڈال سکتا تھا اس کے نتیجہ میں اس کا پورا امکان تھا کہ ان لوگوں سے ہم لوگوں کے پچاس سالہ دیرینہ تعلقات متاثر ہو جاتے۔

بہرحال آپ کے خط اور تار کے آنے پر صورت حال ایسی اچانک بدلی اور متاثر ہوئی کہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ کم از کم یہ رشتہ صرف قانونی طور پر پختہ کر لیا جائے تاکہ قاری صاحب اور ان کے فدائیوں کو یگونہ اعتماد ہو جائے۔ باقی رسومات اسی وقت پوری کی جائیں جب آپ کا مشورہ ہو۔ چنانچہ صورت حال کے دباؤ میں آ کر سادہ طریقہ سے نکاح پڑھا دیا گیا ہے لیکن رخصتی اور دوسری نمایاں رسومات آپ کے جواب یا آمد کے انتظار میں روک لی گئی ہیں کہ آپ کے مشورہ سے ہی انجام پائیں۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ میرے مشورے کے مطابق وقت پر آ گئے ہوتے کہ آپ اپنی آنکھوں سے یہ پیچیدہ صورت حال دیکھ لیتے اور آپ خود بنفس نفیس یہی رائے اختیار کرتے جو کہ آپ کی غیر موجودگی میں اختیار کی گئی ہے۔

اب موجودہ صورت حال یہ بن گئی ہے کہ شادی کی رسومات جو کہ تا حال باقی ہیں وہ کب انجام دی جائیں؟ فاطمہ سلمہا کے لیے بھی یہ ناقابل برداشت ہو رہا ہے کہ تاخیر کی جائے۔ ان کی طبیعت اس مسئلہ خاص میں خاصی کمزور ہو گئی ہے۔ ادھر قاری رشید الحسن بھی تاخیر کے لیے تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ وہ چھ ماہ سے اپنی علیل وضعیف والدہ کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ یہاں اسی مقصد سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مزید تاخیر ان کے لیے ناقابل قبول اور ان کی والدہ کے لیے

ناقابل برداشت ہے۔

لیکن بہرحال ہم آپ کی رائے کے یا خود آپ کی آمد کے بے چینی سے منتظر ہیں۔ آپ یا تو خود تشریف لے آئیں یا بذریعہ تار رائے سے مطلع فرمائیں تاکہ مشکل آسان ہو۔ میں ابھی ابھی حال میں ہی اپنی آنکھ کا آپریشن کرا کے آیا ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے بڑی احتیاط کی تاکید کی تھی۔ گھر پہنچ کر مجھے یہ امید تھی کہ آرام مہیا ہوگا لیکن یہاں آپ کے تار اور خط کے اثر سے جو صورت حال بن گئی ہے وہ میری صحت کے لیے مفید نہیں امید ہے کہ آپ اس کے دور کرنے میں مدد فرمائیں گے۔ میں یہ خط خود اپنے قلم سے نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ لکھوا رہا ہوں۔ والسلام

آپ کا بھائی

ناچیز ابوالحسن علی

۳۰ جولائی ۶۴ء

امتہ اللہ تسنیم

۲۲۰-کٹلری بازار
ہمشیرہ صاحبہ مکرمہ معظمہ مدظلہا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ ہمارا ایکسپریس ڈیلیوری والا خط پہنچ گیا ہوگا جس میں ہم نے یہ اطلاع کی تھی کہ ہم ۲۵ جولائی کو نہیں پہنچ سکیں گے۔ عقد کی تاریخ ۳۰ جولائی رکھی جائے گی اور یا ہمارے آنے کا انتظار نہ کیا جائے۔ اس کام کی تکمیل کر لی جائے۔

کل کی ڈاک سے بھائی میاں کا خط ملا جس میں انہوں نے پھر اس کا تذکرہ کیا ہے کہ ہم نے تم سے جون پور میں جو بات کہی تھی وہ پختہ ہے اور اس کو بھی دہرایا ہے کہ یہ تقریب جاڑوں میں ہونی چاہیے۔ ہم نے آج ہی ان کو جواب دیا ہے کہ بہت سی مصلحتوں کی بنا پر اسی مہینے میں عقد کا ہو جانا ضروری ہے اور یہ بات طے ہو چکی ہم نے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ ۲۸ جولائی تک رائے بریلی آ جائیں اور اپنے ہاتھوں یہ کام انجام دیں۔ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سب کام مکمل ہے۔ ان کو کچھ کرنا نہیں ہوگا' صرف شرکت ضروری ہے۔ امید ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ کر آنے کا ارادہ کر لیں گے۔

امید ہے کہ اب تاریخ آخری طور پر آپ نے طے کر لی ہوگی؟ ہم نے آپ کو بھی لکھ دیا تھا اور رابع سلمہ کو بھی لکھ دیا ہے کہ آپ جتنا روپیہ اس وقت ضروری سمجھیں وہ لکھنؤ سے منگوا لیں۔ ہم وہاں پہنچ کر انتظام کر دیں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں اور سب کام اطمینان سے کریں۔ سادگی اور سنت کے مطابق کام کرنا ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔

آج ان شاء اللہ ہمارے ٹانکے کھل جائیں گے۔ احتیاطاً تین چار دن رہ کر ہم ان شاء اللہ ۲۶ جولائی کو یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ۲۹ جولائی کی صبح کو ان شاء اللہ پہلی گاڑی سے رائے بریلی پہنچ کر جائیں گے۔ والدہ صاحب اور ہمشیرہ صاحب کو میرا اسلام۔

خادم مرتضیٰ آپ سب بزرگوں کی خدمت میں نیازمندانہ سلام عرض کرتا ہے۔

آپ کا نالائق بھائی
ابوالحسن علی

۲۱ جولائی ۶۴ء سہ شنبہ

شاہد حسین

ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ الہند

عزیزی شاہد حسین سلمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ باعث تحریر یہ امر ہے کہ محبی عثمان بھائی کراچی جا رہے ہیں۔ تم دو ڈبے متوسط احمد حسین دلدار حسین کے کارخانے کے ہمارے حساب میں خرید کر ان کے حوالہ کر دو وہ قاری رشید الحسن صاحب کو پہنچا دیں گے۔ وہ مولانا عبدالجلیل صاحب کو بھجوا دیں گے۔ ذرا توجہ اور اہتمام سے یہ کام کرنا رہ نہ جائے۔ ہم کل انشاء اللہ ۹ بجے سے قریب یہاں کے لیے روانہ ہوں گے۔

ابوالحسن

۳ شوال ۸۰

محمد عامر قمر (کراچی)

باسمہ تعالیٰ

لکھنؤ

۲ جولائی ۱۹۹۸ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مکتوب موصول ہوا۔ مولانا گیلانی سے آپ نے جس قلبی وجذباتی تعلق کا اظہار کیا ہے اس سے مسرت ہوئی۔ اس سے بھی خوشی ہوئی کہ آپ مولانا مرحوم کی یادگار کے طور پر ان کے مقالات اور خطوط جمع کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس مولانا مرحوم کے خطوط کی تعداد اکیس ہے۔ مختصر کارڈ بھی ہے اور مفصل لفافے بھی لیکن صورت یہ ہے کہ وہ خطوط اس طرح رجسٹر پر چسپاں ہیں کہ ان کا جدا کرنا اور تصویر لینا تقریباً ناممکن ہے۔ احتیاط سے البتہ انہیں نقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص مل گیا تو اس سے نقل کروا دوں گا۔ خود ہماری صحت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ دوسروں سے خطوط لکھواتا ہوں۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ ''پرانے چراغ'' کے بارے میں جو تاثر آپ نے ظاہر کیا ہے وہ آپ کی محبت اور حسن ظن ہے۔ والسلام

''بہشتی پیداوار'' کتاب مل گئی پسند آئی۔ جزاکم اللہ

مخلص

ابوالحسن ندوی

بقلم نذر

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

مکرمی محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مولانا علی میاں کے حسب ہدایت مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے نام ارسال خدمت ہے۔ خط مل نہیں رہا تھا' اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس کے علاوہ خطوط کے مجموعے میں کوئی اور خط شامل نہ مل سکا ہے۔

خط کی نقل بھیج رہا ہوں۔

محمد الحسنی

۱۵-اگست ۶۳ء

نادر تحریریں

تبصرہ بر ''صمصام الاسلام''

صمصام الاسلام منظوم فتوح الشام کا مختصر تعارف اور اس کی ضرورت

قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اقوام عالم اور سیاسی و جنگی حریفوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا امتیاز اور غلبہ اور کامیابی کا راز اللہ کے وعدوں پر یقین، شہادت کا شوق اور اس کے نتیجہ میں جنت کی نعمتوں کا حصول ہے۔ قرآن مجید میں صاف کہا گیا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ○ (۴:۱۰۴)

''اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا۔ اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو اسی طرح وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں اور تم خدا سے ایسی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھ سکتے اور خدا سب کچھ جانتا اور بڑی حکمت والا ہے۔''

اس حقیقت کے پیش نظر ہر ملک میں مسلمانوں میں اور خاص طور پر مسلمان ممالک کی افواج اور جن کو فوجی خدمت کا موقعہ اور وسائل حاصل ہیں۔ ان میں عزم و ہمت، صبر و ثبات، شجاعت و دلیری کی صفت، راہ خدا میں مصائب برداشت کرنے اور اس پر اللہ کے اجر و ثواب کی طمع اور جنت اور لقائے رب کا شوق اور شہادت فی سبیل اللہ کے فضائل کا استحضار موجود اور زندہ رہنا چاہیے۔ اس لیے ان کو صحابہ کرامؓ کے حالات، مجاہدین اسلام کے کارناموں اور اسلامی

فتوحات کی تاریخ کا مطالعہ اور ان کے سننے سنانے کا اہتمام و انتظام ہونا چاہیے اور ان سرفروشان اسلام اور شہداء و مجاہدین فی سبیل اللہ کی سرفروشی کی داستانیں نظر سے گزرتی اور کانوں میں پڑتی رہنی چاہئیں۔ جن کے سننے سے ایمان تازہ ہو اور سر و بال دوش معلوم ہونے لگے اور زبانِ حال کہنے لگے۔

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جاں فزا سے سر و بالِ دوش ہے

ہندوستان کے بہت سے دیندار مسلمان خاندانوں میں اور بالخصوص ضلع رائے بریلی کے سادات کے گھرانے اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہید بالاکوٹ (ش ۱۲۴۶ھ) کے خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشغلہ کی ضرورت ہوتی' ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں اور اسی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق کلامی متوفی ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء) کی منظوم فتوح الشام (جس کا نام انہوں نے صمصام الاسلام رکھا تھا) پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق کلامی مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمشیر زادہ منشی سید حمید الدین صاحب کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمٰن صاحب کے نواسے تھے' واقدی کی عربی فتوح الشام کو کلامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی اور جوش و ولی جذبہ کے ساتھ پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا تھا' چونکہ ان کو اس کا طبع ذوق تھا' اور جہاد اور حرارتِ ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا' اس لیے نظم میں جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت سیف اللہ خالد بن ولید سے شاعر کو عشق تھا اور خواب میں بار بار ان کی زیارتیں ہوئی تھیں' اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے' میری بڑی خالہ مرحومہ جو قرآن شریف کی حافظہ تھیں یہ منظوم فتوح الشام بڑے پر اثر اور دلکش لہجہ میں

پڑھتی تھیں، پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہوگئی تھی، عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لیے آ جاتے اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بہ ارادہ بیٹھ جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

جب سادہ اور بے تکلف لیکن پر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھے جاتے تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہ بنت الازور اور دوسرے صحابہ کرام و مجاہدین شام کی جانبازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ طاری ہو جاتا۔ کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا۔

فتوح الشام کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوشش کم نہیں کر سکی۔ خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں، پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے پائیداری بخشی ہو، کیسے مٹ سکتے ہیں؟

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب کے خلاف (جس کے مقدر میں قیامت تک کے لیے اسلام کا عالمگیر حریف اور مدمقابل بننا لکھ دیا گیا ہے اور جس کی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے) ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا، جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہ آ سکے۔

ہندوستان کے نامور مورخ و مصنف اور اسی حسنی خاندان سادات کے عظیم فرد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ و مصنف ''نزھۃ الخواطر'' (۱-۸) ''وگل

رعنا'' وغیرہ) حضرت کلامی کی کتاب ''گوہر مخزون'' کے تعارف اور پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''آپ کے دادا مولوی سید حمید الدین صاحب متخلص بہ حمیدی' میر منشی نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ٹونک اور آپ کے نانا قطب الامراء حضرت سید عبدالرحمٰن خاں بہادر مظفر دونوں جناب مولانا سید احمد قدس سرہ العزیز کے ہمشیر زادہ اور مولوی سید محمد علی (صاحب ''مخزن احمد'') کے حقیقی بھائی تھے۔ ان کو حسن اتفاق کہنا چاہیے کہ مولوی صاحب ممدوح نے فارسی میں نظم فرمایا تھا اور آپ نے اردو میں' واقعات کا نظم کرنا بہت مشکل ہے مگر جس نے فتوح الشام کو پچیس ہزار شعروں میں نظم کیا ہو اس کے نزدیک اس مختصر رسالہ کا نظم کر دینا کیا بڑی بات ہے۔ صمصام الاسلام منظوم فتوح الشام کی نظم آپ کی ایسی مقبول ہوئی کہ چند دنوں میں دوبارہ چھاپی گئی۔''

صمصام الاسلام ۱۲۹۷ھ میں تکمیل کو پہنچی، ۱۳۱۲ھ میں کتاب چھپنا شروع ہوئی ۱۳۱۳ھ-۱۸۹۴ء میں طبع ہوئی' کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن (۱۳۱۷ھ ۱۹۰۰ء میں نکلا۔ یہ دونوں ایڈیشن مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے' اودھ' دوآبہ اور راج پوتانہ کے بہت سے دیندار خاندانوں میں اس کے مجلسوں میں پڑھے جانے کا رواج تھا اور اس سے دلوں میں دینی حمیت' شوق جہاد' قوت ایمانی اور جذبہ جاں فروشی پیدا ہوا تھا۔ ضرورت ہے کہ دوبارہ اس کتاب سے فائدہ اٹھایا جائے اور دینی حمیت' جذبہء جہاد اور شوقِ شہادت پیدا کرنے میں اس سے کام لیا جائے کہ محض ضابطہ کی خانہ پری اور ایسی تقریروں اور تحریروں سے جن میں ایمانی روح' قلبی تاثیر' فضائل جہاد کا حوالہ اور بنیاد نہ ہو اور جو صحابہ کرام اور شہدائے اسلام کی مثالوں اور نمونوں سے خالی ہوں ہزار زور خطابت اور مصالح و منافع کی ترغیب کے باوجود وہ جوش و اثر نہیں پیدا کیا جا سکتا اور ان میں وہ برکت و روحانیت نہیں جو صحابہ کرام اور ابتدائی صدیوں کے مجاہدین اسلام کے واقعات میں ہے۔

ابوالحسن علی ندوی
۱۷ شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ
۵ مارچ ۱۹۹۱ء

دیباچہ نسب نامہ وشجرہ

حضرت مولانا نے ہمارے خاندان کے نسب نامہ اور شجرہ مرتبہ برادرِ عزیز سید عامر حسنی صاحب پر جو دیباچہ لکھا تھا اس کی نقل بھی شامل کی جا رہی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سادات قطبیہ کا خاندان ہندوستان میں طویل عرصہ سے آباد ہے اور مقام شکر ہے کہ اس نے اپنی بہت سی خصوصیات برقرار رکھی ہیں اور ہر دور میں دین کی حفاظت و خدمت کا فرض انجام دیا اور آج بھی اس کو اس تحتی بر اعظم میں عزت و نیک نامی حاصل ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کی تاریخ اور نسب نامہ محفوظ کر دیا جائے۔ اس لیے کہ یہ کام اگر نہ ہوا تو اس خانوادے کی نئی نسل رفتہ رفتہ اپنے نسب اور تاریخ سے بیگانہ ہو جائے گی۔

یہ ایک بہت محنت طلب کام تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے عزیز سید عامر حسنی نے جن کو اس خاندان کے انساب سے ہمیشہ دلچسپی رہی اور انہوں نے اس سلسلے میں خاصی معلومات فراہم کر لی ہیں، اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور اس کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔

یہ کتاب دراصل ''گلشن محمودی'' مرتبہ سید عبدالشکور صاحب (م ۱۲۸۲ھ) کا ترجمہ ہے اس کے علاوہ انہوں نے اس میں بڑی عرق ریزی سے متعدد نقشے بھی شامل کیے ہیں۔ جن سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ خدا کرے اس کتاب سے وہ اہم مقصد پورا ہو جس کے لیے عزیز مصنف نے اس قدر اہتمام و دلچسپی، جانفشانی اور تلاش و جستجو سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس محنت کو قبول فرمائے اور کتاب کو مقبول فرمائے۔

ابوالحسن علی

کراچی ۹ شعبان ۱۳۹۸ھ

تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی میں افسوس ناک تحریف اور حذف کردہ عبارت

ہمارے جد بزرگوار حضرت سید شاہ علم اللہ پر عزیزی مولانا محمد الحسنی عرف محمد میاں مرحوم ایڈیٹر البعث الاسلامی کی کتاب ''تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلی'' دوبارہ مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی سے شائع ہوئی۔ اس میں ''شجرات'' مرتبہ سید عامر حسنی صاحب مرحوم بھی آخر میں شامل کیے گئے مگر نہایت تکلیف، افسوس اور رنج کا مقام ہے کہ کتاب میں سے ہمارے مورث عالی سید السادات امیر کبیر سید قطب الدین محمد الحسنی والحسینی المدنی کڑوی کے والد بزرگوار سید رشید الدین احمد کا بیان نکال دیا گیا۔

جن حضرات کے پاس تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی'' کا کراچی ایڈیشن ہے وہ اس کے صفحہ بیس پر چوتھی سطر کے بعد اور پانچویں سطر کے ذیلی عنوان سے قبل ذیل کی حذف کردہ عبارت کا اضافہ فرمالیں۔ مجھ سے غلط بیانی کی گئی کہ ہندوستان میں یہ تذکرہ دوبارہ شائع ہوا ہے۔ اس میں یہ بیان نہیں ہے۔ حال آنکہ ہندوستان میں یہ تذکرہ دوبارہ شائع ہی نہیں ہوا۔

ہندوستان میں جو تذکرہ شائع ہوا تھا وہ میرے عزیز دوست مولانا محمد ثانی حسنی مرحوم نے خود اپنے مکتبہ'' مکتبہء اسلام'' ۳۷۔ گوئن روڈ لکھنؤ سے جولائی ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا اور مجھے خاص طور سے ایک کاپی بھیجی تھی۔ اس میں سید رشید الدین احمد کا بیان موجود ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے تذکرہ میں تاریخ بھی نہیں دی گئی۔

سید رشید الدین احمد

سید رشید الدین احمد وہ پہلے شخص ہیں جو مدینہ سے بغداد آئے۔ ان کی جلالت شان اور مرتبہ روحانی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ سیکڑوں طلبہ وعلماء ہر وقت ان کے قافلے کے ساتھ رہتے تھے۔ میر سید علی ہمدانی صاحب عمدۃ المطالب نے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

سید رشید الدین احمدؒ ۵۲۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۸ھ میں اسّی سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ مولانا غلام رسول مہر اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ آخر تک بغداد میں مقیم رہے اور وہیں وفات پائی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حظیرہ میں دفن ہوئے لیکن تذکرۃ الابرار اور تذکرۃ السادات میں ہے کہ انہوں نے تاتاریوں کے ہنگامہ میں جامِ شہادت نوش کیا اور ان کے ساتھ بہت سے علماء بھی شہید ہوئے جو ان کے ہمراہ رہتے تھے۔

سید رشید الدین احمد کی شادی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی صاحبزادی سے ہوئی (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سیدنا موسیٰ الجون بن سید عبداللہ المحض کی اولاد میں ہیں) اور انہیں کے بطن سے امیر کبیر قطب الدین محمد مدنی کی ولادت ہوئی جو اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کہلائے اور جن کے ذریعہ یہ شجرۂ طوبیٰ ہندوستان میں پروان چڑھا اور برگ وبار لایا۔

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان

سرپرست	:	مولانا فضل الرحمٰن
نگران	:	ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی
چیئرمین	:	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری
مینیجنگ ڈائریکٹر	:	محمد فاروق قریشی
ڈائریکٹر فنانس	:	الطاف حسین موتی
ڈائریکٹر پبلی کیشنز	:	مفتی محمد جمیل خان

مجلس عملی

مولانا سید نصیب علی شاہ بخاری	اکرام القادری
مولانا سید عبدالغفور شاہ	محمد ادریس اپل
شمس القمر قاسمی	

مجلس انتظامی

مولانا عبدالحکیم اکبری	حافظ محمد ریاض درانی
ملک سکندر خان ایڈووکیٹ	حافظ عبدالقیوم نعمانی
نجیم خان ایڈووکیٹ	ڈاکٹر محمد شکیل
غلام قادر بروہی ایڈووکیٹ	افتخار احمد لودھی
محمد اکبر شاہ ہاشمی	حاجی مسعود پاریکھ